MAY
2026

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

یکم مئی

مزدوروں کا عالمی دن

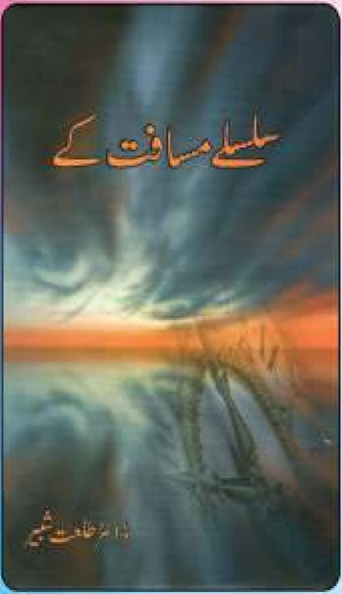
سلسلے مسافت کے
ڈاکٹر طلعت شبیر

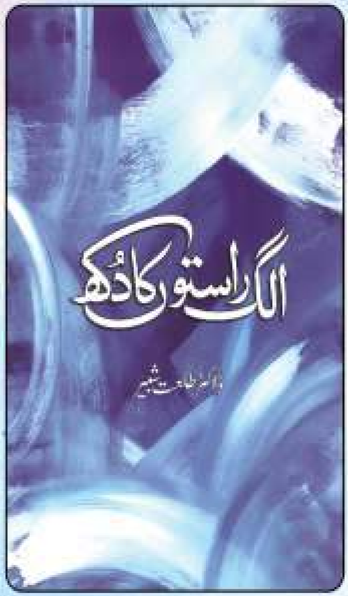
الگ راستوں کا دُکھ
ڈاکٹر طلعت شبیر

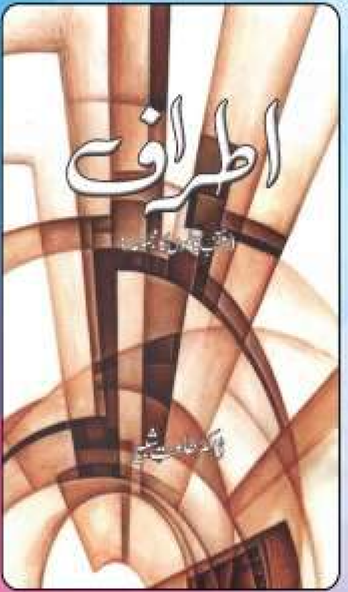
اطراف
ڈاکٹر طلعت شبیر

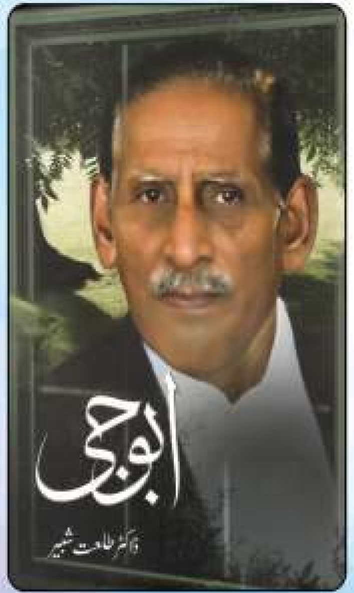
ابو جی
ڈاکٹر طلعت شبیر

بانی مدیر: خالد احمد

اجمال

کیا عہد تھا ، وہ؟ کیا ربط تھا ، جو؟ اے جان تمنا! ٹوٹ گیا
کس طور کہیں ؟ کیا ٹوٹ گیا؟ تفصیل میں جانا ٹھیک نہیں

کیا تم سے کہیں ؟ اے شام الم ، کس آن ؟ وہ تارا ٹوٹ گیا
کیا عہد تھا؟ وہ ، کیا ربط تھا؟ جو، اے جان تمنا! ٹوٹ گیا
اے تار تہ مضراب ستم ، وہ تار نفس تھا! ٹوٹ گیا
اے مست الم ، یاران بہم! یوں اشک بہانا ٹھیک نہیں

کیا عہد تھا، وہ؟ کیا ربط تھا ، جو؟ اے جان تمنا!ٹوٹ گیا
کس طور کہیں؟ کیا ٹوٹ گیا؟ تفصیل میں جانا ٹھیک نہیں

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

▪ **Karachi:** (021) 34541301-7 ▪ **Lahore:** (042) 37083901-9
▪ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ▪ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
▪ **Faisalabad:** (041) 8542924 ▪ **Peshawar:** (091) 5252311 ▪ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - مئی 2026 - شمارہ نمبر: 5

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاوید احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: عالمی یومِ مزدور

قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے زرک ایڈ سنز پرنٹرز 16 کلومیٹر زرعی فارم سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، محمد انیس انصاری، محمد افضال انجم	7 تا 10
2	نعت	خاور اعجاز، محمد یٰسین قمر، محمد افضال انجم، اکرم ناصر، مظہر امام، نبیل احمد نبیل، محمد نوید مرزا، سرور حسین نقشبندی، خالق آرزو، شہاب اللہ شہاب	11 تا 20
3	عقیدت	مرزا آصف رسول	21
4	رباعیات	سعید اشعر، محمد نصیر زندہ	22 تا 23
5	قطعات	اجمل اعجاز	24
6	ہائیکو	آفتاب خان	25
7	ماہیے	خاور اعجاز	26
8	افسانے	حنیف باوا، اسلام عظمی، آسناتھ کنول، دردانہ نوشین خان، فصیحہ آصف خان، عاصم علی، بابر امین، حمزہ حسن شیخ، عمار نعیمی، عامر عباس ناصر اعوان، صفورا پرویز، طوبیٰ صدیقی، نعمان منظور	27 تا 73
9	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، انور شعور، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، نسیم سحر، طارق بٹ، محمد انیس انصاری، قیوم طاہر، راحت سرحدی	74 تا 154

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	باقی احمد پوری، خورشید ربانی، سعداللہ شاہ، نیر سرحدی، غافر شہزاد افتخار شاہد، اکرم ناصر، اقبال سروبہ، رضا اللہ حیدر، احمد جلیل شوکت محمود شوکت، مسعود احمد، ابو طالب انیم، جمیل احمد نبیل افروز رضوی، رخشندہ نوید، شگفتہ نعیم ہاشمی، اعجاز دانش، مظہر امام رانا سعید دوشی، تنویر قاضی، محمد نوید مرزا، احمد سبحانی آکاش، وسیم جبران اصغر علی بلوچ، فیض رسول فیضان، اعجاز روشن، افضل ہزاروی عابد خان عابد، امر مہکی، عون الحسن غازی، ارشد محمود ارشد علمدار حسین، شمشیر حیدر، اشرف یعقوبی، میتھیو محسن، نوید عاجز محمد ظہیر قندیل، ریاض ندیم نیازی، عاصم اعجاز، ہمایوں پرویز شاہد دلشاد احمد، اکرم جاذب، عابد رضا، افتخار الحق، آصف خیال اکمل حنیف، سرور فرحان، نائلہ راٹھور، احمد نواز، قمر بشیر محمد اشفاق بیگ، خالق آرزو، اسد رضا سحر، شاہ روم خان ولی فرح شاہد، سرور حسین نقشبندی، رخسانہ سمن، نعمان محمود، صغیر احمد صغیر شبیر نازش، مسکان گل، جیا قریشی، راشدہ کنول، رضوانہ مسرت، جمشید کمبوہ عاصم بخاری، مرتضیٰ سید، امتیاز انجم، غضنفر مہدی، کوکی گل، ثمر جمال	74 تا 154
10	مضامین	جلیل عالی، خاور اعجاز، نسیم سحر، جمیل احمد عدیل، نذر عابد طلعت شبیر، افتخار الحق، سکندر بیگ مرزا، طاہر شبیر اعجاز روشن، بلال اکمل قریشی، نجمہ منصور، طارق حنیف، ارفع ناصر	155 تا 212
11	طنز و مزاح خاکہ	محمد کلیم	213 تا 215
12	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، محمد انیس انصاری، سید افسر ساجد شاہنواز زیدی، حامد یزدانی، طلعت شبیر، مسعود احمد، امجد بابر آشا تجھ کنول، فیاض تحسین، تنویر قاضی، فیض رسول فیضان نائلہ راٹھور، شبیر آکاش، عابد رضا، انوار انجم، سید فرخ رضا ترمذی کنول شہزادی، فوزیہ غزل، محمد عبداللہ، نعمان منظور، نوید صادق	216 تا 241

حمد

جہانوں میں جو کچھ ہے تیری عطا ہے
تو مالک ہے، مولا ہے، سب کا خدا ہے

نہیں کوئی تیرے مقابل کہیں بھی
جو رستہ ہے تیرا وہ آراستہ ہے

نواہی کا منکر ، اوامر کا حامی
پسندیدہ تیرا رفیق وفا ہے

تیرے حرف کن سے ہے رونق جہاں میں
اندھیرے ہیں غائب، ضیا ہی ضیا ہے

تجھے ڈھونڈنے کا ہے آسان رستہ
مدینے کو جاتا ترا راستہ ہے

نہ مانے بظاہر کوئی تجھ کو منکر
مگر دل ہی دل میں تجھے مانتا ہے

مری سجدہ ریزی بڑی کارگر ہے
ریاض ثمر کا عجب ذائقہ ہے

سید ریاض حسین زیدی

حمد

نظر مری پسِ اَفلاک ہو تو حمد کہوں
کچھ اُس کی ذات کا اِدراک ہو تو حمد کہوں

گداز دل میں ذرا اَور پیدا ہو جائے
یہ آنکھ اَور بھی نمناک ہو تو حمد کہوں

میں ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں، سمیٹ لوں خود کو
بحال یہ دلِ صد چاک ہو تو حمد کہوں

ابھی تو ہے مری آنکھوں پہ جہل کا پردہ
مَیں مُنتظر ہوں کہ یہ چاک ہو تو حمد کہوں

زمیں پہ رہ کے مری سوچ کچھ حدود میں ہے
کوئی اشارۂ افلاک ہو تو حمد کہوں

پُرانے لگتے ہیں لفظوں کے پیرہن مجھ کو
عطا کوئی نئی پوشاک ہو تو حمد کہوں

نگاہِ خواجۂ لولاک ہو تو بات بنے
عطائے خواجۂ لولاک ہو تو حمد کہوں

گھرا ہوا ہوں میں دُنیا کی علتوں میں نسیمؔ
کدورتوں سے یہ دل پاک ہو تو حمد کہوں

نسیمِ سحر

حمد

نہیں تھا جب کوئی بھی، وہ اُس وقت بھی تھا
جب کوئی بھی نہ ہوگا، وہ تب بھی ہوگا

وہ سُبحان ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں
اور کوئی معبود نہیں ہے اُس کے سِوا

سب محدود، اُسی کی ذات ہے لامحدود
ہر شے فانی، صرف اُسی کے لیے بقا

اربوں، کھربوں انساں آئے دنیا میں
لے کے اپنے اپنے چہرے، جُدا جُدا

ارض وسما اُس کی تخلیق کے شہ پارے
کہاں سے لاؤ گے خالق، اُس کے جیسا

جتنی کتابیں، آج تلک لکھی گئی ہیں
اُس کی ایک کتاب ہے اُن سب سے بالا

پھیلتا جاتا ہے اک دائرہ حیرت کا
جیسے جیسے اُس کے بارے میں سوچا

کیا کہیے، کہ اُس کی حقیقت، جانِ انیس!
انسانی حدِ اِدراک سے ہے بالا

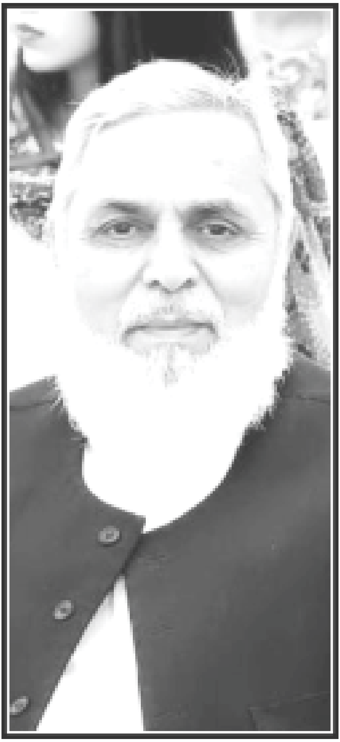

محمد انیس انصاری

حمد

ترے کرم کی ہے ہر سو بہار ، یااللہ
کروں میں نعمتیں کیسے شمار ، یااللہ

تُو رکھنا اپنی ہی حفظ و امان میں ہر دم
نہ دشمنوں کا ترے ہوں شکار ، یااللہ

کبھی بھی بھولوں نہ مقصد میں خلق آدم کا
کہ تُو ہی ہے مرا پروردگار ، یااللہ

ترے نبیؐ مکرم کی راہ چلنا ہے
رہے یہ دھن مرے سر پر سوار ، یااللہ

رواں دواں رہے یہ سلسلہ کرم کا ترے
کبھی نہ ٹوٹے مرا اعتبار ، یااللہ

مجھے تُو اپنا ہی بندہ بنا کے رکھ مولیٰ
ترے کرم کے رہوں میں نثار ، یااللہ

میں مستقیم تری راہ پر رہوں قائم
عدو کا چل نہ سکے کوئی وار ، یااللہ

بنایا ختمِ رسلؐ کا جو اُمتی تُو نے
تو سلسلہ یہ رہے پائیدار ، یااللہ

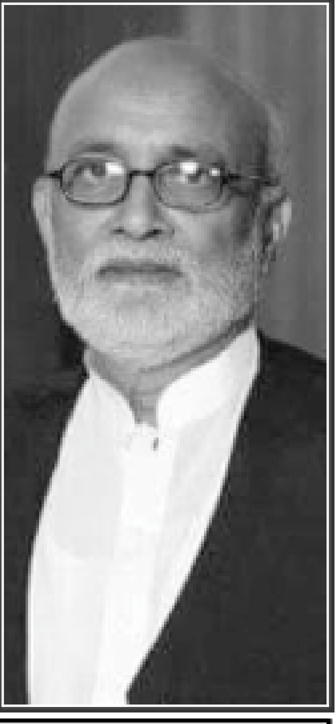

محمد افضال انجم

نعتؐ

رہِ وجدان روشن کر گئے ہیں
وہؐ سب امکان روشن کر گئے ہیں

زمانے راستہ پوچھیں گے ہم سے
وہؐ یوں اذہان روشن کر گئے ہیں

مجھے وہؐ سایۂ رحمت میں لے کر
مری پہچان روشن کر گئے ہیں

جلے ہیں جب چراغ یاد اُنؐ کے
شبِ ویران روشن کر گئے ہیں

بہت دھندلے تھے سب منظر مگر وہؐ
ہمارے دھیان روشن کر گئے ہیں

جہاں بھی آئے ہیں اسمائے احمدؐ
مرا دیوان روشن کر گئے ہیں

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کے عشق کا سورج چمکا، کیسی رُت آئی
ایک ہی سمت اُڑے جاتی ہے، کونجوں کی ہر ڈار

نعتؐ

شانِ رسولؐ مجتبیٰ، صلِّ علیٰ محمدؐ
رفعتِ سیّد الوریٰ، صلِّ علیٰ محمدؐ

شانِ نبی کو سوچیے، ان کا مقام کھوجیے
فکرِ رسا بھی نا رسا، صلِّ علیٰ محمدؐ

نیّرِ لامکاں ہیں وہ، سرورؐ دو جہاں ہیں وہ
ذات و صفاتِ مصطفےٰؐ، صلِّ علیٰ محمدؐ

وقفِ ثنائے مصطفےٰؐ جان و دل و سخن ہوئے
خامۂ نور مل گیا، صلِّ علیٰ محمدؐ

رونقِ بزمِ رنگ و بو، خلقِ خدا کی جستجو
ذاتِ حبیبِؐ کبریا، صلِّ علیٰ محمدؐ

میں نے ابھی خیال میں سوچا تھا اُنؐ کی ذات کو
ہاتفِ غیب نے کہا، صلِّ علیٰ محمدؐ

جذبوں کی شش جہات میں، لفظوں کی کائنات میں
علم و عمل کا مدعا، صلِّ علیٰ محمدؐ

اُنؐ کے جمال و نور سے بزمِ حیات سج گئی
جانِ جہانِ دوسرا، صلِّ علیٰ محمدؐ

روزِ جزا قمر ہمیں قربِ نبیؐ نصیب ہو
ہم بھی کہیں یہ برملا، صلِّ علیٰ محمدؐ

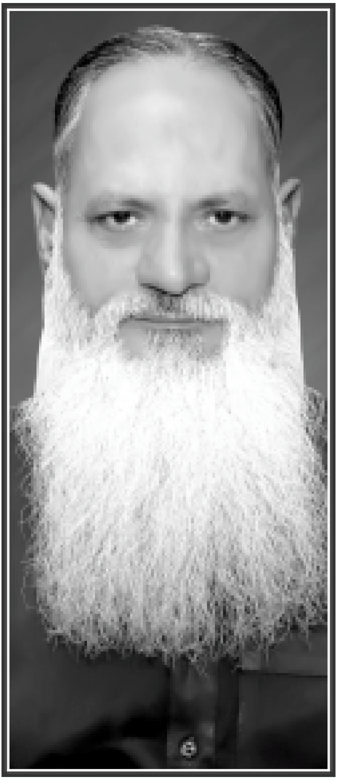

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

مدحت کا باب اور ہے عرضِ سخن تمام
آ جائے کام نعت میں میرا لحن تمام

کمخواب جب سے سمجھا ہوں اس در کی اُترنیں
کم تر بھی میرا، اعلیٰ ہوا، پیرہن تمام

اُنؐ کی ثنا کے پھول سجاتا ہوں اس طرح
حیرت سے تکتے رہتے ہیں سرو و سمن تمام

ذکرِ جنابِ سیدِؐ کونین لب پہ ہے
جود و کرم جو کرتے ہیں شاہِؐ زمن تمام

پاتا ہوں خود کو میں جو مدینے میں رات دن
اس در کی سمت رہتی ہے دل کی لگن تمام

جب جب ہو انؐ کے اُسوۂ احسن کا ذکرِ خیر
رہتی ہے خوشبوؤں میں بسی انجمن تمام

سر پہ مرے ہے رحمتِ ہر دو جہاں کا ہاتھ
رکھتا ہوں خود کو پیشِ شہہ ذوالمننؐ تمام

ہوتی ہے نعت سرورِ کون و مکاں رقم
جب جب ہو جذب و حرف کا باہم ملن تمام

لب پر حبیبؐ داورِ محشر کی ہے ثنا
میں پا رہا ہوں اپنا مہکتا دہن تمام

انجم ہیں ہم بھی نعت کی دولت سے سرفراز
کیسے نہ خرچ کیجیے حرفوں کا دھن تمام

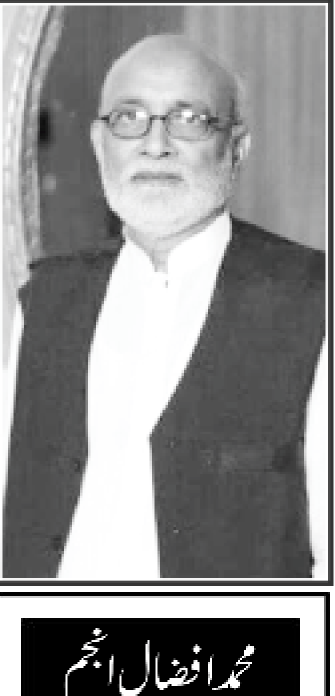

محمد افضال انجم

نعت ﷺ

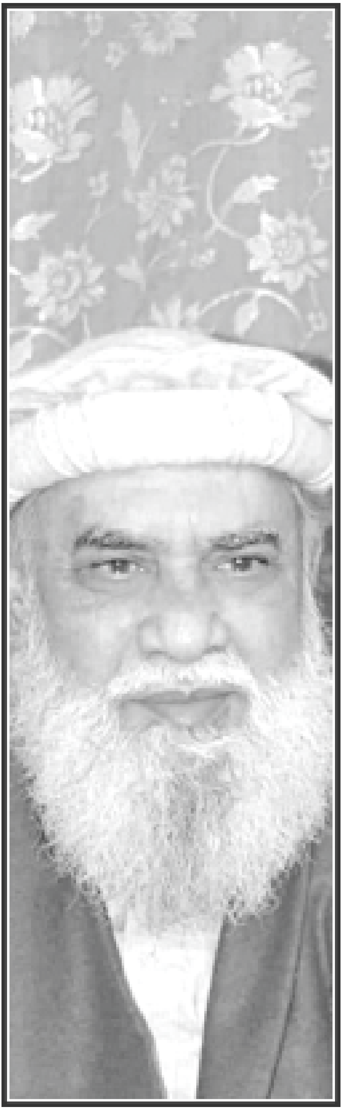

دیکھنا، کعبہ کی چوکھٹ، اور مرا سر دیکھنا
دیکھنا اک دن مرا حسنِ مقدر دیکھنا

قریہ قریہ، کوچہ کوچہ، اور گھر گھر دیکھنا
و رفعنا لک ذکرک سے معطر دیکھنا

دیکھنا سرکار کا اندازِ عفو و درگزر
خواب میں طائف کے رستے کے وہ پتھر دیکھنا

اس جہانِ رنگ و بو کا کونہ کونہ ایک دن
نقشِ پاپوش محمد سے منور دیکھنا

مشغلہ ہے اب وہاں جا کر جو دیکھا تھا کبھی
بند آنکھوں سے مدینہ کا وہ منظر دیکھنا

ایسا بد خصلت ہے، دیکھو شجرِ ممنوعہ کی سمت
پھر بلاتا ہے ہمیں شیطان کا شر دیکھنا

ورنہ مارا جاؤں گا میں، حشر کے میدان میں
بھولنا مجھ کو نہیں، میرے پیمبر دیکھنا

اکرم ناصر

نعت ﷺ

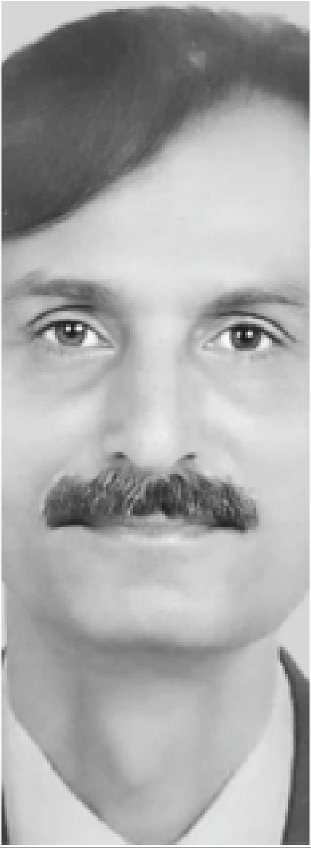

مظہر امام

نبی کے ذکر سے کیا خوش کلام ہو گیا ہوں
میں دنیا بھر میں بڑا نیک نام ہو گیا ہوں

بڑے بڑے مجھے تکریم سے نوازتے ہیں
شہِ عرب کا میں جب سے غلام ہو گیا ہوں

فضائے دہر میں کیونکر نہ سر اُٹھا کے چلوں
گدائے کوچۂ عالی مقام ہو گیا ہوں

میں اپنے آقا و مولا کی پاک نسبت سے
جہاں میں لائقِ صد احترام ہو گیا ہوں

مری تلاش میں رہتی ہیں خوشبوئیں جب سے
میں وقفِ مدحتِ خیر الانام ہو گیا ہوں

جہاں سے مجھ کو سروکار کچھ رہا ہی نہیں
میں جب سے وقفِ درود و سلام ہو گیا ہوں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کی نکہت رنگ سے قریہ قریہ گل آثار
کس کے چراغ کی لو سے جھلمل جھلمل طاق بہار

نعتؐ

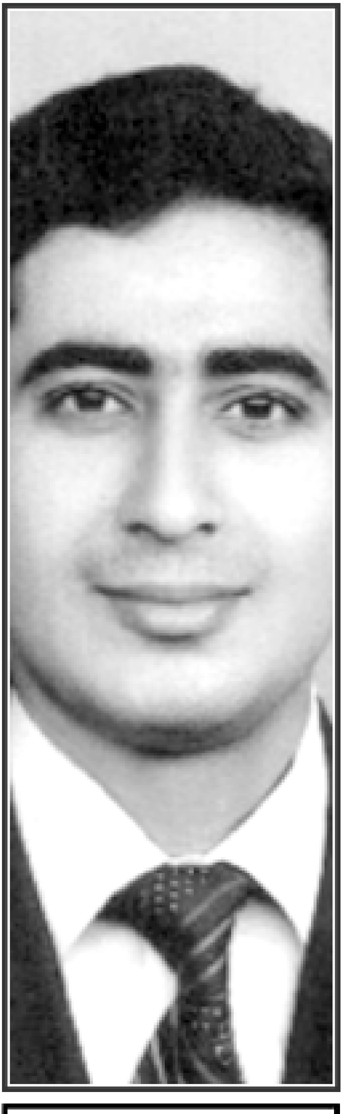

درا صل درِ رسولؐ کا ، مرکز شفا کا ہے
درماں یہی تو ہر مرضِ لادوا کا ہے

آئے نسیمِ طیبہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے
اور کہہ دے تُو غلام درِ مصطفیٰؐ کا ہے

یوں لگ رہا ہے میرے تصور کے شہر میں
جھونکا سا کوئی شہرِ نبیؐ کی ہَوا کا ہے

شب کو جو سر پہ کاہکشاں ہے کھنچی ہوئی
ہر عکس اُس کا آپؐ کے ہی نقشِ پا کا ہے

اِک طرزِ خاص دل سے جو اُٹھتی ہے نعت کی
نسخہ ضرور یہ بھی کوئی کیمیا کا ہے

توصیفِ مصطفیٰؐ ہے لبوں پر مرے نبیلؔ
مجھ پر یہ لطفِ خاص بھی میرے خدا کا ہے

نبیل احمد نبیلؔ

نعتؐ

ان کی آمد سے رواں ہے روشنی
ورنہ دنیا میں کہاں ہے روشنی

نور کی پوشاک میں لپٹی ہوئی
آسماں در آسماں ہے روشنی

جالیاں روضے کی ہیں تھامی ہوئیں
میں وہیں پر ہوں، جہاں ہے روشنی

بجھ رہے ہیں کفر کے سارے چراغ
ظلمتوں کے درمیاں ہے روشنی

کس نے دیکھا ہے عرب کے چاند کو
جن کے پیکر سے عیاں ہے روشنی

ہر گھڑی صلِّ علیٰ کا ورد ہے
آج کل میرا مکاں ہے روشنی

جانبِ بطحا سفر کرتی ہوئی
جانے کتنی بیکراں ہے روشنی

محمد نوید مرزا

نعتؐ

جب بھی طیبہ ترے گلزار میں آ جاتے ہیں
ولولے کیسے دلِ زار میں آ جاتے ہیں

بادشاہوں کو بھی پڑتی ہے ضرورت جس دم
لے کے کاسہ اسی دربار میں آ جاتے ہیں

شہر طیبہ میں ہی اے کاش مسلسل ہو قیام
ہم تو گھر لوٹ کے بے کار میں آ جاتے ہیں

ضعف حائل نہیں ہوتا ہے مدینے آ کر
حوصلے لاغر و لاچار میں آ جاتے ہیں

ہاتھ پھیلائے ہوئے فخر سے شاہانِ جہاں
سر جھکا کر اسی سرکار میں آ جاتے ہیں

درِ والا پہ صدا دے تو سبھی لعل و گہر
دامنِ مفلس و نادار میں آ جاتے ہیں

قدر جب کرتے نہیں ان کی زمانے والے
بے ہنر آپ کے دربار میں آ جاتے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ مدینے میں پہنچ کر سرور
"قریۂ مدحتِ سرکار میں آ جاتے ہیں"

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

مرا ڈوبتا پار ہو گا سفینہ ۔۔۔!
جب آجائے گا رحمتوں کا مہینہ

محمدؐ کا اسمِ گرامی ازل سے
چمکتا ہے دل میں مثالِ نگینہ

قلم لکھ رہا ہے محمدؐ کی مدحت
مجھے راس آیا ہے دنیا میں جینا

مری آرزو کو بھی مقبول کر لیں
مدینے میں بن جائے میرا دفینہ

وضو چشمِ تر نے کیا آنسوؤں سے
مجھے نعت گوئی کا آیا قرینہ۔۔!

بلائیں گے عاصی کو سرکارِ عالم
کریں گے عطا رحمتوں کا خزینہ

قدم رکھ دیا میرے آقاؐ نے جس جا
وہی عاصیوں کو ہے جنت کا زینہ

میں قدموں میں مولا کے بیٹھوں گا ہر دم
ہے پیشِ نظر اب مدینہ مدینہ۔۔۔۔۔!

خالق آرزو

نعتؐ

محمدؐ سا کوئی دنیا میں آیا ہے نہ آئے گا
نگاہوں کو کوئی اتنا نہ بھایا ہے نہ بھائے گا

یہی ایمانِ کامل ہے، یہی پختہ عقیدہ ہے
زمانے پر کوئی اُن سا نہ چھایا ہے نہ چھائے گا

درود اُن پر جو پڑھتا ہے سکوں پاتا ہے ہر دم وہ
کوئی بھی ذکر لطف ایسا نہ لایا ہے نہ لائے گا

کسی بھی وقت پہنچے جو کوئی بھی شخص طیبہ میں
درِ رحمت سے خالی ہاتھ آیا ہے نہ آئے گا

مرا سرمایہءِ ہستی شہاب ان کی محبت ہے
کوئی سرمایہ اس جیسا نہ بھایا ہے نہ بھائے گا

شہاب اللہ شہاب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قصد مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شانِ خدا، خوشبو کے کنگن، ڈھالے گا لوہار

عقیدت

بارسالتِ کبریٰ ! لا الہ الا اللہ
کون ہے محمدؐ سا؟ لا الہ الا اللہ

بعثتِ محمدؐ ہے اِس لیے کہ دنیا میں
سب پہ ہو کرم فرما لا الہ الا اللہ

بے لباس رشتوں کو اُسوۂ مزمل نے
کیا تقدس اوڑھایا: لا الہ الا اللہ

تو بھی سیکھ لے جیسے عزم و استقامت نے
مصطفیٰ سے ہے سیکھا لا الہ الا اللہ

حاوی آج کانوں پر ہیں شکم، سنیں کیسے؟
صوتِ مسجدِ اقصیٰ : لا الہ الا اللہ

ملتِ محمدؐ ہے وارث اُس ہدایت کی
جس کو کھو چکی ''سینا'' : لا الہ الا اللہ

رفعتِ محمدؐ ہے عرش سے بھی بالاتر
شاہدِ شبِ اسرا لا الہ الا اللہ

جو نہ پا سکا اب تک رازِ اسمِ احمد
فاش اُس پہ کیا ہوتا ؟ لا الہ الا اللہ

شیر ہو محمدؐ کے تو ڈرو نہ بھیڑوں سے
ہے تمھارا ہی غلبہ: لا الہ الا اللہ

ہر سفر محاسن کا ہے درِ محمدؐ تک
راہ و رسمِ منزلہا لا الہ الا اللہ

اُٹھ یہ وقت ہے آصف! پھر شہادتِ حق دے
سب پہ حق محمدؐ کا: لا الہ الا اللہ

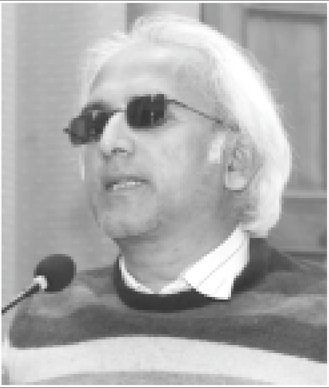

مرزا آصف رسول

رباعیات

مرتا ہوا بیمار ذرا دیکھ تو لے
گرتی ہوئی دیوار ذرا دیکھ تو لے
شاید تجھے ہٹ کے نظر آئے منظر
جلتے ہوئے اشجار ذرا دیکھ تو لے

بے شک مرا ایمان ہے طاقت میری
لوگوں میں یہ پہچان ہے طاقت میری
کہتا ہوں فقط دل سے میں اپنی باتیں
ہر لفظ مرا مان ہے ، طاقت میری

کھڑکی میں رکھا پھول بدلنا ہو گا
اپنا تمھیں معمول بدلنا ہو گا
اظہار محبت کے کئی رستے ہیں
جو بھی نہیں معقول، بدلنا ہو گا

بیٹھا ہوں یہاں ، تُو بھی سرائے میں آ
دلکش ہے سماں ، تُو بھی سرائے میں آ
بن جائے گا میرے لیے اس موسم میں
اک اور جہاں ، تُو بھی سرائے میں آ

دل والوں کے دربار میں ویرانی ہے
اب آنکھوں کے بازار میں ویرانی ہے
ہر سمت ہی لفظوں کے بچھے ہیں کانٹے
گفتار کے گل زار میں ویرانی ہے

گفتار کا آرام سے ریشم کاتو
اشعار کا آرام سے ریشم کاتو
الفاظ کے دھاگے ہیں بڑے ہی نازک
معیار کا آرام سے ریشم کاتو

سپنا کوئی آنکھوں میں پڑا رہتا ہے
کاغذ کوئی جیبوں میں پڑا رہتا ہے
جانے اسے کیوں کوئی بھی جا راس نہیں
اک شخص کہ رستوں میں پڑا رہتا ہے

رہ آیا ہو کاغان کی ہریالی میں
کہسار کی ، میدان کی ہریالی میں
کہنے کی اجازت ہو اگر تو کہہ دوں
کچھ ہٹ کے ہے انسان کی ہریالی میں

سعید اشعر

رباعیات

کل آج کے سائے پہ گرا ہے ساقی
سورج آگے نکل گیا ہے ساقی
تقدیر سے باغی ہیں مشینوں کے گناہ
بندوں کو خدا ڈھونڈ رہا ہے ساقی

اے کاش خوشی میں غم سمونے دیتا
ہنس ہنس کے مجھے وصل میں رونے دیتا
بے رنگ مصور نے کیا رنگ میں قید
تصویر سے باہر نہیں ہونے دیتا

جمہوری روش ہو کہ ملوکانہ امنگ
ظاہر ہے دخترانِ ابلیس کا رنگ
سرمایہ ہے آشوبِ جہاں گیر کا راز
لڑتا ہے انسان کسی اور کی جنگ

کرتی ہے رقص دن چڑھے رات یہاں
اب ہوتا نہیں جشنِ مکافات یہاں
آدم کی بستی میں خدا ہے خاموش
گولی کی زباں سے ہوتی ہے بات یہاں

خورشید نظر نجم و قمر آس میں بوئے
الماس و گہر دریا کی پیاس میں بوئے
وہ سب ہوئے افکار کے مشعل بردار
الفاظ جو روزگارِ قرطاس میں بوئے

روبوٹ کے نطفے سے ہوں انساں پیدا
ایسے بھی ہو رہے ہیں امکاں پیدا
اہلِ یورپ کریں گے دوزخ ایجاد
دنیا میں ہوں گے نئے شیطاں پیدا

بوسہ رخِ مینا و سبو کو دیا بھی
دیوارِ گماں سے آگے دیکھا کیا بھی
جاتی ہے مرے خیال کی لو کہاں تک
جلتا ہوں میں بھی سورج کا دیا بھی

موہوم قبا گلشنِ جاں پوش ہوا
خاکستری نقش سایباں پوش ہوا
آیا نہ خیالِ رخِ آئینہ فریب
آوازۂ تصویر گماں پوش ہو

محمد نصیر زندہ

قطعات

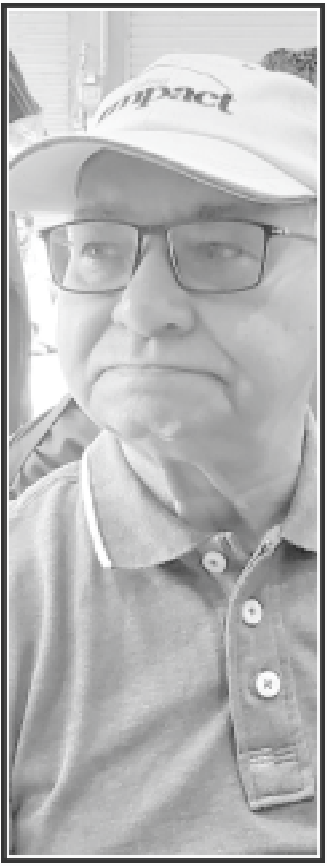

اجمل اعجاز

ایک پل ٹکنے نہیں دیتی یہ وحشت دل کی
شام ہوتی ہے تو میں گھر سے نکل جاتا ہوں
چلتا رہتا ہوں بہت دیر تلک بے مقصد
اور پھر رکنا جو چاہوں تو پھسل جاتا ہوں

....

بے وفائی کو سہنے والا دل
عمر بھر بدگمان رہتا ہے
توڑ کر دل کو جوڑ دو لیکن
ٹوٹنے کا نشان رہتا ہے

....

زلزلے کے تھے آرہے جھٹکے
پُرخطر زندگی ہماری تھی
ایک تصویر تھی جو دل کے قریب
بس وہ دیوار سے اتاری تھی

------------ انتخاب ------------

خالد احمد

تنہائی سی تنہائی تھی، کرتا بھی تو کیا میں
سو، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا میں

------------ نعمان منظور ------------

ہائیکو

خار زندہ، گلاب زندہ ہیں
نوچ سکتا ہے کون ذہنوں سے
میری آنکھوں میں خواب زندہ ہیں

درد ہے دل میں، دل میں چھید نہیں
عشق کیسے تباہ کرتا ہے
ہر کسی پر کھلا یہ بھید نہیں

عکس اُس کا تھا ہر زمانے پر
ناگ کالے کا سخت پہرہ تھا
پشت در پشت اک خزانے پر

جانبِ دشت ساربان چلا
سب سے آگے نکل بھی سکتا ہے
اُونٹ جو سب کے درمیان چلا

رات ہنسوں کی جو قطاریں ہیں
حُسن ان سے فضا کا بجتا ہے
ان کے دم سے یہاں بہاریں ہیں

پھر سے ناچے گا مور جنگل میں
شام اُتری ہے اب اُداس اُداس
کم ہے چڑیوں کا شور جنگل میں

گاؤں کی ان اُجاڑ گلیوں میں
آج برسات بوند بوند ٹپک
رنگ بھر دے تُو سوکھی کلیوں میں

جانے والے نے جیسے حد کر دی
ہجر اتنا طویل ہونے لگا
سُرخ چہرے پہ چھا گئی زردی

تیرے گھر وقتِ شام آؤں گا
سبز پتا ہوں، چھُو کے دیکھ مجھے
مَیں خزاں میں بھی کام آؤں گا

شہ سواروں کی بات چیت سُنو!
جا رہے ہیں وہ قونیہ کی طرف
اُن سے بچھڑے ہوؤں کے گیت سُنو!

چوتھی جنگ لڑ بھی سکتے ہیں
گر ہواؤں سے ہار جائیں پات
تب درختوں سے جھڑ بھی سکتے ہیں

کیسے بدلیں گے دن غریبوں کے
دیکھ یہ نبض کائنات کبھی
چل نہ پائے گی بن غریبوں کے

سنگ باری کرے گا لفظوں کی
اُس نے سیکھے ہیں یہ ہنر سارے
جنگ جاری کرے گا لفظوں کی

آفتاب خان

ماہیے

خاور اعجاز

شہروں کی کہانی ہے
لڑکا پنڈی کا
لڑکی ملتانی ہے

اِک تیر عمودی ہے
وہ شہری لڑکی
بالکل بارودی ہے

باتیں متوازی ہیں
لیکن باطن میں
ہم دونوں راضی ہیں

اِک حد پہ رہتا ہے
لیکن دریا میں
مل کر ہی بہتا ہے

جنگلے میں ڈاک آئی
تتلی سے پوچھو
پھول آیا کہ خاک آئی

وہ، ایک فاصلہ [افسانچہ]

وہ ایک بوڑھا تھا جو اپنی عمر کے پچاسی برس کھا مر چکا تھا۔

نوٹوں سے بھری جیب والا

وہ ایک بہت ہی امیر بیٹوں کا باپ تھا

اُس کا لباس نہایت صاف ستھرا اور قیمتی ہوتا تھا

کھانے کو بھی اُسے غذاؤں سے پُر کھانا مل جایا کرتا تھا

وہ بہ ظاہر عیش کی زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن؟ سُنیئے

پچاسی برس ہضم کرنے کے بعد اس کا احوال کچھ یوں تھا

جب وہ چلنے پھرنے سے لاچار ہو گیا تو اُسے وسیع و عریض اور خوب صورت کمرہ دے دیا گیا تھا__ باقی کی زندگی بسر کرنے کے لیے

اُس کمرے کی بائیں دیوار پر ایک اے سی چپکا ہوا تھا جو اُسے گرمیوں کے موسم میں راحت پہنچاتا تھا۔

جب سردی آتی تو اُس کے حوالے ایک صاف ستھرا گرم بستر کر دیا جاتا جو اسے بستر سے باہر کی سردی سے بچاتا تھا۔

باقی رہا اُس کے اپنے اندر کے موسموں کا حال۔ احوال یہ رہ جائے یا اُس کا بطون جانے کہتے ہیں کہ اس کی بتایا زندگی کی کل کائنات بھی ایک کمرہ تھا۔ باقی بس اُس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے چار ملازم تعینات کر رکھے تھے جو شب و روز اُس کے پاس رہتے جو اُسے اُن کی اپنی تنخواہوں سے مطابقت رکھنے والی خدمات اُسے باہم پہنچاتے۔

حنیف باوا

اُس کے دولت مند بیٹے جو تعداد کے لحاظ
سے تین تھے مہینے میں ایک آدھ بار اس کا
حال پوچھنے آجاتے۔
جب وہ پوچھتے ''ابا جی کیا حال ہے آپ کا؟
وہ بس اتنا کہہ کے سونا بند کر لیتا۔ ''ٹھیک
ہے۔ اچھا ہے۔''
اُن دولت مند بیٹوں نے اپنے اُس والد کو
کس طرح رکھا ہوا تھا یہ تو اُس کے بیٹے ہی
بتا سکتے تھے۔
حال احوال پوچھنے کے بعد باہر آ کر لوگوں کو
یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے تھے
''ہمیشہ والد کو اس طرح رکھنا چاہیے، جس
طرح ہم نے رکھا ہوا ہے۔ سمجھے آپ انھوں
نے کس طرح رکھا ہوا تھا یہ جاننا لوگوں کے
لیے اتنا ضروری بھی نہیں تھا، لیکن اتنا سننے
کے بعد وہ اپنے چہروں پر ایک عجیب سی
مسکراہٹ ضرور بکھیرتے جب سے وہ اپنا
کروڑوں کا کاروبار ان تینوں بیٹوں کے
حوالے کر کے تنہا رہ گیا۔ کچھ عرصہ تو وہ چلنے
پھرنے کے قابل رہا۔ لیکن جب سے اُس
کی ٹانگوں نے ایک قدم بھی چلنے سے انکار
کر دیا تو وہ اس خوب صورت کمرے کا قیدی
بن کر رہ گیا۔
بھلے ہی اُسے زندگی کی تمام سہولیات میسر
تھیں۔ لیکن، لیکن، دیکھیے
اُسے اس کمرے سے باہر کی فضا میں سانس
لینا نصیب نہیں تھا۔
یہی وہ سانس تھا جو اُسے اپنے کاروبار
میں مصروف رکھنے کے لیے مدد و معاون
ثابت ہوتا تھا۔
نیز یہی سانس تھا، جو اُسے خوشگوار زندگی
سے جوڑے رکھتا تھا۔
سب سے بڑھ کر وہ گفتگو جو وہ اپنے دفتر
میں بیٹھ کر اُس کے پاس آنے جانے والوں
سے کرتا وہ اُس کے ذہن سے اُٹھنے والی
پراگندہ سوچوں سے دور رکھتی اب جب
سے وہ اس کمرے کا قیدی ہوا وہ ان تمام
رحمتوں سے دور ہو گیا لیکن پھر بھی۔ وہ کبھی
مایوس نہیں ہوا تھا۔
کیونکہ اُسے قوی امید تھی کہ اُس کے بیٹے
ایک نا ایک روز اُس کے پاس ضرور آئیں
گے اور وہ اُسے اس اندھی کوٹھڑی سے ضرور
باہر نکالیں گے۔
ضرور ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ یقیناً ایسا ہی
ہوگا۔
وہ ایسا سوچتا تھا اپنے ان بیٹوں کے لیے جو
آج تک اُس سے کافی فاصلے پر رہتے تھے۔

☆☆☆☆☆

جنگ اور ٹوٹے پھوٹے خواب

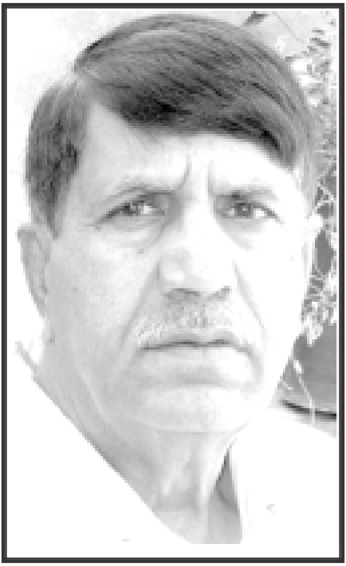

اسلام عظمی

دو دنوں کے بعد وہ سالانہ چھٹی پر جانے والا تھا اور اُسے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ ایک نووارد گورا اُس کی غیر حاضری میں اُس کے فرائض سرانجام دے گا۔ سڑکوں کی تعمیر کے دوران کلائنٹ کے ساتھ کیے معاہدے کے تحت ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر رواج کے مطابق ایشیائی سٹاف کی جگہ عموماً کوئی دوسرا ایشیائی کارکن ہی لیتا تھا۔

اس کے تجربے کے مطابق پہلی بار یہ روایت ٹوٹ رہی تھی۔ اور ایک برطانوی گورا ایک ایشیائی کی جگہ ڈیوٹی کرنے والا تھا۔

دوپہر کے وقفے میں کچھ دیر تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے اس پراجیکٹ کا مہندس مقیم یا Resident Engineer سائٹ کا چکر لگانے کے بعد اس کے کمرے میں آیا تھا اور اس نے بڑی سنجیدگی سے اسے بتایا تھا کہ آج ہماری ملکہ اس شہر میں تشریف لا کر اس شہر کی عزت افزائی کر رہی ہے۔

عبدالسلام نے نظریں اٹھا کر مہندس مقیم کی طرف دیکھا اور کہا۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آج کے اخبار میں تو ایسی کوئی خبر نہیں --- اس نے تازہ انگریزی اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تازہ انگریزی اخبار اس کی میز کے دائیں طرف بڑی ڈرائنگ ٹیبل پڑا تھا۔ اخبار پڑھنے کی لت اسے بچپن ہی سے تھی۔ آفس آتے ہوئے وہ رستے سے انگریزی

اخبار خرید لیتا۔ خبروں پر سرسری سی نظر ڈالتا اور اپنی میز کے ساتھ پڑے ڈھلوانی میز پر رکھ دیتا۔ میز کے نیچے والی طرف لکڑی کی ایک پٹی جڑی تھی جو ڈرائنگ یا اخبار کو نیچے پھسلنے سے روکتی دیتی۔

وہ سائٹ پر مل ملا کر چھے لوگ تھے۔ ایک برطانوی، دوسرا ہانگ کانگ کا چینی، تین انڈین اور وہ خود۔ سبھی ساتھی اخبار اس کے کمرے میں آ کر پڑھتے۔ کبھی کبھار وہ کسی وجہ سے لیٹ ہو جاتا تو ڈرائنگ ٹیبل پر پڑا پچھلے دن کا اخبار پڑھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ وہاں فضول کی گپیں اخبارات میں نہیں چھپتی تھیں۔ اور چھپی ہوئی خبریں سنسنی خیز بھی نہ ہوتی تھیں۔ لیکن تازہ خبریں جاننے کا شوق بھی ایک نشے سا ہے۔ اکثر لوگوں کو دن بھر کی کل کل کے بعد پڑھی ہوئی خبریں بھول چکی ہوتی تھیں۔

مہندس مقیم نے ایک نظر اخبار پر ڈالی۔ قہقہہ لگایا اور پھر کہا۔

عبدالسلام، یہ خبر اخبار میں نہیں مگر مصدقہ ہے۔ تم اگر اپنے کمرے سے نکل کر کنکریٹ پلانٹ کے پیچھے والی بڑی سڑک کی طرف نظر دوڑاؤ تو تمھیں وہاں سوٹ پہنے اور ٹائی لگائے ایک شخص گھومتا نظر آئے گا۔ پارہ چوالیس کو چھو رہا ہے۔ ایسی گرمی میں کوئی پاگل ہی سوٹ پہن کر اور ٹائی لگا کر سڑک پر گھوم سکتا ہے۔ اس کے اس اہتمام سے لگتا ہے کہ ملکہ اس سڑک سے گزرنے والی ہے۔ اور اسے ہاتھ ہلا کر ملکہ کو ویلکم کہنا ہے۔ پھر ملکہ نے خوش ہو کر گاڑی سے اتر کر اسے مصافحے کا شرف بخشنا ہے۔

مہندس مقیم نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ خوش مزاج اور خوش طبع گورا تھا۔ ملکہ کے سڑک سے گزرنا والے ٹوٹے کو چھوڑ کر اس کی بات درست لگتی تھی۔ کسی وجہ سے وہاں ایسا کوئی شخص ہونا ناممکن نہ تھا۔ جون جولائی کی دھوپ میں کنٹریکٹرنگ کمپنیوں میں کام کرنے والے یورپی عموماً اور بعض لبنانی انجینئر نکریں پہن لیا کرتے تھے۔ اپنی گاڑی پارک کرتے ہی وہ پینٹ اتار کر نیکر پہن لیتے۔ پینٹ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر چلی جاتی، جہاں ایک ٹائی پہلے سے پڑی ہوتی۔ جب انھیں اپنے یا کسی سرکاری دفتر میں کسی کام سے جانا پڑ جاتا تو نیکر اتار کر پینٹ پہن لیتے اور ٹائی لگا لیتے۔ اور پنجابی محاورے کے مطابق باؤ بن جاتے۔ کچھ روز پہلے وہ اپنے بیٹے کو ساتھ

لے آیا تھا۔ اور اس نے پوچھا تھا کہ گوروں نے نیکریں کیوں پہن رکھی ہیں۔
کنٹریکٹروں کو پوری پینٹ پہننے کی اجازت نہیں۔
پھر آپ نے پینٹ کیوں پہنی ہوئی ہے۔
ارے بھائی، میں کنسلٹنگ فرم میں کام کرتا ہوں۔ حکم صرف کنٹریکٹر کے انجینئروں کے لیے ہے۔
اسی اثنا میں ٹی بوائے اپنے ساتھ سوٹ پہنے اور ٹائی لگائے ایک منحنی سے اجنبی کو لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اجنبی ایک گورا ہی تھا۔ ٹی بوائے نے کہا۔
سر، مہندس مقیم نے اسے آپ کے پاس بھیجا ہے۔
عبدالسلام کو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ مہندس مقیم نے کچھ دیر پہلے شاید اسی گورے کو دیکھ کر کہانی گھڑی تھی۔ عموماً طور جب کسی شخص کو سٹاف کے کسی فرد سے متعارف کروانا ہوتا تھا تو مہندس مقیم اس کے ساتھ خود آتا تھا مگر اس بار ٹی بوائے کے ساتھ کیوں---
ٹی بوائے چلا گیا تو آنے والے نے کہا۔
ہیلو، میں ڈیوڈ کرانسکی ہوں - آج ہی سعودیہ سے آیا ہوں - میں آفس سے ڈرائیور مجھے اس سائٹ پر لا رہا تھا کہ گاڑی کسی خرابی کے باعث مین روڈ پر رک گئی۔ یہاں چل کر پہنچا ہوں۔
ڈرائیور دور سے مجھے آفس دکھا کر ورکشاپ والوں کو فون کرنے کے لیے سڑک پار چلا گیا تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ کب لوٹے۔ تمھارا نام---
عبدالسلام۔
عبدس کہہ سکتا ہوں۔ وہ بولا۔
یورپی رواج کے مطابق تو کہا جا سکتا ہے۔ مگر پورا نام پکارنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر جب نام عبد سے شروع ہو۔
یہ میں بھی جانتا ہوں۔ ڈیوڈ کرانسکی مسکرایا اور کہا - نو پرابلم - میں جہاں سے آیا ہوں وہاں کی دھوپ یہاں کی دھوپ سے بھی کہیں زیادہ ظالم ہے۔

سالانہ چھٹی سے واپسی کے بعد عبدالسلام کے اپنے دفتری کمرے میں داخل ہوتے ہی ڈیوڈ کرانسکی اُٹھ کر میز کے دوسری طرف آ گیا اور پہلے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرایا۔
تمھاری سیٹ اور تمھیں مبارک۔
یورپی رواج کے مطابق کوئی بندہ بھی مل کر اپنے ماتحت کی نشست پر نہیں بیٹھتا تھا۔

مہندس مقیم کو سٹاف کے کسی فرد سے کچھ پوچھنا ہوتا تو اسے اپنے کمرے میں بلانے کے بجائے چل کر اس فرد کے پاس جاتا اور کھڑے کھڑے ہی بات کر کے چلا جاتا۔

مگر ڈیوڈ کرانسکی برطانوی ہونے کے باوجود عبدالسلام کو الگ سا لگا تھا۔ اسے سعودیہ سے یہاں ٹرانسفر کرنے کی وجہ ایران عراق جنگ تھی۔ کمپنیوں نے نیا سٹاف بھرتی کرنے کے بجائے موجود افراد کو ضرورت کے مطابق ادھر ادھر کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سسٹم فرنچ سسٹم کہلاتا تھا۔ اس نظام میں کسی بھی بندے کو بوقت ضرورت کوئی بھی ڈیوٹی دے دی جاتی۔

کرانسکی کی ڈیوٹی شہر کے آس پاس کے پراجیکٹوں پر تعمیراتی مواد کی نگرانی تھی۔ یا کنسلٹنٹ اور کنٹریکٹر کے جھگڑوں کو نپٹانا تھا۔ مگر برطانوی ہونے باوجود اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہ تھا۔ لائسنس بننے تک اسے اس کے فلیٹ سے لانے اور واپس چھوڑنے کی ذمہ داری عبدالسلام پر ڈال دی گئی۔ اسے ایک بلڈنگ جس کے نیچے مالا باری سپر مارکیٹ اور ایرانی تندور تھا کے ایک فلیٹ میں اسے اکاؤنٹس منیجر کے ساتھ ٹھہرا دیا گیا۔ ڈیوٹی کے اوقات صبح سات سے بارہ اور بعد دوپہر دو سے پانچ تھے۔ وہ صبح میں ان کے ساتھ گاڑی میں آتا۔ کچھ دیر اس سائٹ پر رکتا۔ پھر گاڑی سے اسے کسی دوسرے سائٹ پر چھوڑ آتی۔ کام زیادہ ہوتا تو وہیں رک جاتا۔ نہیں تو واپس آ جاتا۔ اس طرح انھیں گپیں مارنے کے لیے کئی گھنٹے مل جاتے۔

اس نے بتایا کہ آپ لوگ مجھے برطانوی سمجھتے ہو مگر برطانوی مجھے برطانوی نہیں سمجھتے۔ میرے والدین دوسری عالمی جنگ کے بعد وسطی یورپ سے بھاگ کر برطانیہ آئے تھے اور ابھی تک اس کا سٹیٹس مہاجر کا ہے۔ مہاجرت صدیوں پرانا المیہ تھا مگر ہوتے ہوتے قانونی مہاجرت سے غیر قانونی مہاجرت کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔

والدین کی قانونی مہاجرت کے باوجود کرانسکی میں برطانوی عادات خال ہی تھیں۔ نئے سال کی پارٹیوں پر بھی وہ دوسرے گوروں سے الگ تھلگ ہی رہتا۔ پینے پلانے کا شوق بھی اسے کم تھا۔ جب کہ کئی گورے تو قاضی کو مفت کی شراب کی طرح اپنے اندر انڈیلنے لگے۔ کئی فیملی والے گورے تو ایسی پارٹیوں پر خود گاڑی چلا کر

آنے کے بجائے ڈرائیور کے ساتھ آتے
تاکہ واپسی پر صحیح سلامت گھر پہنچ جائیں۔
کسی کسی روز کرانسکی خاصا اپ سیٹ نظر
آتا۔ عبدالسلام اس سے خفگی کا سبب پوچھتا
تو وہ بتاتا۔
میں پہلی بار فلیٹ شیئر کر رہا ہوں۔ اور وہ بھی
بدقسمتی سے ایک لفنگے گورے کے ساتھ۔ وہ
ویک اینڈ پر اپنی کسی گرل فرینڈ کو فلیٹ پر
لے آتا ہے۔ ان کا سامنا کرنے کے بجائے
میں خود کو اپنے کمرے تک محدود رکھتا
ہوں اور ٹی وی دیکھتا رہتا ہوں۔ مگر ایک
ہی فلیٹ میں رہنے کی وجہ سے گاہے بگاہے
ٹکراؤ ہو ہی جاتا ہے۔ میرا فلیٹ فیلو گورا تو
خیر لفنگا ہے مگر اس کی گرل فرینڈ شرمندہ سی
لگتی ہے۔
عبدالسلام اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔
ایک روز کرانسکی سائٹ پر آیا تو قدرے
اداس تھا۔
کیا پھر کوئی انہونی ہو گئی ہے۔
نہیں وہ مسکرایا۔
نئے بجٹ میں نئے پراجیکٹوں کی اپروول
تاخیر کا شکار ہو گئی ہے۔
ایران عراق کی جنگ کی وجہ سے ایسا ہونا
ہی تھا۔

تب پراجیکٹ آخری مرحلے پر تھا۔ کرانسکی
نے کہا۔
کل عجیب واقعہ ہوا۔
کیا۔
میں ایرانی تنور پر روٹی خریدنے گیا۔ پہلے
سے کھڑے گاہک تندور والے کی گرما گرمی
چل رہی تھی۔ درجہ حرارت چوالیس ڈگری۔
دکان کے اندر تندور۔
کرانسکی نے بات بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔
ان کی گفتگو سے مجھے بس شیٹی کا لفظ سمجھ میں
آیا۔ تندور والے نے اس گاہک کو روٹیاں
دینے سے انکار کر دیا اور مجھے بھی۔ مجھے کیوں
اس نے روٹی دینے سے انکار کیا۔
تم دوسرے گاہک کی بات پر مسکرائے
ہو گے۔
یوں سمجھو کہ کبھی مسکرانا بھی جرم بن جاتا ہے۔
کرانسکی مسکرا دیا۔
یہ بات کم و بیش چھیالس برس باسی ہے۔
چھیالیس برسوں میں تصویریں بھی رنگ
چھوڑ جاتی ہیں۔ کون جانے تنور والا،
کرانسکی، اس کا فلیٹ میٹ اور فلیٹ میٹ
کی گرل فرینڈ کہاں ہیں۔۔۔
اللہ ہی جانے۔

☆☆☆☆☆

”سونامی“

عجیب سی بات ہے اور حیرت انگیز بھی۔ خیر یہ تو سب کا اپنا اپنا نظریہ ہے کہ وہ کسی بات پر کس حد تک یقین کرتا ہے۔ نہ کریں یقین۔ میں بھی تو نہیں کرتی۔ آپ نے کبھی ہوائی محبت کا نام سُنا ہے؟ جی ضرور سنا ہوگا بلکہ اب تو آپ دیکھ بھی رہے ہیں۔ الیکٹرانکس محبت، ٹیلیفونک لو، انٹرنیٹ چیٹنگ کے ذریعے ہونے والی محبت وغیرہ وغیرہ۔ کچھ پرانی محبتیں ہوا کرتی تھیں۔ محبوب کو محض کبھی کبھار ایک نظر دیکھ کر آہیں بھرنا، وصل کی خواہش میں ہجر کا دریا پار کرتے کرتے خود پار ہو جانا۔ کچھ دھانسو قسم کی بڑی عظیم محبتیں بھی ہوئیں جو بے حد مشہور ہیں اور ہزاروں ان سے متاثر ہوئے۔ کئی لوگوں نے تو جانیں گنوا دیں۔

ویسے اگر محبت کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کیا جائے تو یہ جان لیوا بہت ہے۔ اس کے جان لیوا اثرات کی وجہ سے ہی تو صنفِ ادب تخلیق ہوئی۔ شاعری، افسانہ، ناول، داستان، کہانی، قصے، سینہ بہ سینہ چلنے والے قصے اور راز، غرض جو کچھ تخلیق ہو سکتا۔ اس محبت کا فرادانے تو کئی ایک کیا ہزاروں کو کافر بنایا۔ محبت کے جملہ ستم کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ ہر انسان زندگی میں ناکام یا کامیاب، پوشیدہ یا ظاہری کسی نہ کسی محبت کا شکار ضرور ہوتا ہے۔ وہ لمحاتی محبت ہو، پہلی نظر کی محبت ہو یا پھر طویل مدت تک چلنے والی جو مر کر بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کئی تو ایسے سورما گذرے ہیں جن کے لیے ایک محبت کافی نہیں ہوئی۔ وہ ایک زندگی میں کئی محبتیں کرتے اور ان میں کامیاب ہوتے رہے۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں محبت کی ساری گرائمر کھول کر بیٹھ گئی ہوں، اب اس کی اقسام بیان کروں گی۔ اس کے منفی اور مثبت نتائج کو اخذ کروں گی۔ تو قارئین ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ تو بس ایک تمہید باندھنے کی کوشش تھی تا کہ اپنی ہوائی قسم کی محبت کو بیان کر سکوں۔ ابھی تک یہ راز تھا۔ اب خود اسے افشا کر رہی ہوں۔ ویسے بھی عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے تو پھر خود

آسناتھ کنول

ہی کیوں نہ ظاہر کردوں۔ اور پھر جس بات کا کوئی انجام ہی نہ ہو، اُس سے ڈر کیسا؟

نام سے تو واقف تھی کہ وہ ایک بڑی شخصیت ہے مگر اس سے ذاتی واقفیت نہیں تھی۔ خواہش تو ہوتی ہے کہ بڑے لوگوں سے ملا جائے، اُنہیں دیکھا جائے، ان سے بات کی جائے۔ پھر مجھ جیسے مڈل کلاس لوگوں کے اندر تو یہ خواہش اور بھی تیزی کے ساتھ پنپتی ہے۔ میری بھی خواہش تھی کہ اپنی ادبی دُنیا کے درخشاں ستاروں سے ملوں جن کی تحریروں کو پڑھ کر ہم اپنے جملے سنوارتے ہیں۔ جن کے بے تحاشا علم کی وجہ سے ہم اپنی راہیں تیار کرتے ہیں۔ تاکہ آگے چل کر ان جیسے بن سکیں۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں میں خود کو تلاش کرتے کرتے میں بھی ایسی بے شمار تمناؤں کی اسیر ہوتی رہی۔ تحریر کی دُنیا سے رابطہ بھی تو کوئی ایسی بات نہیں جو ہر شخص کو متاثر کرے اور ہمارا فرمایا ہوا اتنا بھی مستند نہیں ہوتا کہ کوئی مقام دلا سکے۔ بس اسی تگ و دو میں زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی ---- گھر داری، بچے اپنی سوشل مصروفیات، شوہر کی ملازمت کی بے تحاشا مصروفیات۔ زندگی نے کبھی کھل کر کسی سے محبت کرنے کا وقت ہی نہیں دیا۔ جو چھوٹی موٹی محبتیں راستے میں آتی رہیں وہ کبھی راہ کی دیوار نہ بن سکیں۔ کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو دامن پکڑتا، جو راہ روکتا۔ کسی کی آہیں میرے لیے نہیں تھیں۔ کسی نے آنسو نہیں بہائے۔ لمحاتی اور جذباتی بہاؤ سمجھ کر میں بھی یہ ندی نالے عبور کر گئی۔ بالآخر شادی ہو گئی اور پھر زندگی ایک سطح پر ٹھہر گئی۔ اس کی زیریں لہروں میں بے شک کبھی کبھی ہلچل تو ہوتی رہتی۔ زندگی کے ٹھہراؤ سے بغاوت ہو سکے یا کچھ ایسا جو تبدیلی پیدا کرے، Home Sickness مٹا سکے۔ کچھ بھی نہ ہو سکا۔ زمین پر چھائی دُھند اور جسم کی تھکن تھپک تھپک کر سلا دیتے۔ بچوں کے کام، مسائل، دیکھ بھال میں اپنا آپ بچتا کہاں ہے۔ میں خود بھی اپنی ذات کے اندر کہیں گم ہو گئی۔ کبھی کبھی موڈ میں ہوتی۔ وقت ملتا تو خود کو جھاڑ پونچھ کر دیکھتی۔ خود سے سوال کرتی، کیا ہوں؟ کون ہوں؟ ---- جواب ندارد۔

جب اپنی خوب صورتی اور ہنر ماتا میں ڈھل جائے تو پھر عورت کے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے۔ سُلگنے اور سسکنے کا یہ عمل عملی طور پر ذہن و دل کے ساتھ جسم بھی جاد کرتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ ماں کے اندر ایک جیتی جاگتی عورت بھی تھی جو لامحدود خواہشات کو محدود کے پیمانے میں ڈھانپتی رہتی تھی۔ سارے پھیلاؤ سمٹ کر آنکھوں کے اندر قید ہو گئے۔ لفظوں نے زنجیریں پہن لیں۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ اپنے لیے نہیں تھی۔ پھیلتا ہوا بدن بیماریوں کی آماجگاہ بن گیا۔ دراصل عورت کا

کوئی قصور نہیں۔ یہ سارا قصور اس شعور اور آگہی کا ہے۔ جو ہمیں اندر سے تبدیل کرتی ہے۔ اس خود آگہی نے، بے تحاشا اعتماد نے، علم نے مجھے بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ پھر زندگی کی اس طویل مشقت میں آنے والے حادثات بھی تو اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ کچھ گہرے صدمات نے ذہنی تباہی میں حصہ ڈالا۔ ایسا کہ میں گھنٹوں، دنوں اور سالوں کی زندگی نہیں گزارتی، لمحاتی زندگی جس میں کوئی منصوبے نہیں، پلاننگ نہیں، ترقی نہیں، خود پر ہنسی آتی ہے کی زندگی ایسے بھی گذرتی ہے بھلا۔ اس کے لیے تو بہت سے جذبات کی شدت چاہیے، تعلق چاہیے، محبت چاہیے، جذبہ چاہیے۔ مجھ جیسی سوچنے والی عورت خود کو ہارنے لگے تو زندگی غم کی آماجگاہ بن جائے۔ ایسے میں اگر کوئی ہمارے لبوں پر ایک شاندار قہقہہ سجا دے تو کیا لگے گا۔ یہی ہوا تھا میرے ساتھ۔

ایک گرم تپتی دوپہر میں جب میں بچوں کو دوپہر کا کھانا کھلا کر فارغ ہوئی تو اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ ایک خوب صورت گمبھیر سی آواز نے جیسے دل پر دستک دی۔ گرم دوپہر میں جیسے زیارت کی ساری ٹھنڈک لاہور میں آ گئی ہو۔ ایک آواز نے سماعت کو باندی بنا لیا۔ ہیلو میڈم آپ کیسی ہیں؟ میں گُل خان بات کر رہا ہوں۔ میری ایک کتاب پر آپ کا تبصرہ پڑھا۔ آپ بہت شاندار لکھتی ہیں۔ میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ وہ بولتا رہا اور میں اپنے پسندیدہ لکھاری کی آواز کے زیر و بم میں ڈوبتی اُبھرتی رہی، حیرت کے آسمان پر چڑھی۔ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اُس سے کیا کہوں۔ بس شکریہ کہتی رہی۔ اُس نے خدا حافظ کہا اور میں زندگی میں واپس آ گئی۔ میں بے تحاشا خوش ہوئی۔ زندگی میں شاید پہلی بار میں بے حد خوش اور حیران تھی۔ پہلی بار محسوس ہوا، زندگی اتنی بُری چیز بھی نہیں کہ اس کی قدر نہ کی جائے۔ زندگی اُداس رہی ہے تو یہ خوش بھی تو کرتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہو گئے۔ بہت ساری باتیں، گپ شپ، زندگی اور دیگر مسائل پر گفتگو، علمی، ادبی، سماجی، ثقافتی، مذہبی، روایتی گفتگو، گویا اک چلن، اک وطیرہ سا بن گئی۔ جب بھی وقت ملتا مجھے اُس سے باتیں کرنا اچھا لگتا۔ میں جیسے ہلکی پھلکی ہو جاتی۔ میں نے اُس سے گفتگو کے بارے میں اپنے شوہر کو بتایا تھا۔ بلکہ اکثر کئی باتیں میں اپنے شوہر کو بھی بتاتی۔

تحریروں کا تبادلہ ہونے لگا۔ گُل خان نے اپنی ساری کتابیں مجھے بھیجیں۔ میں نے بھی روانہ کیں۔ تبصرے، تذکرے، تجربے، تعریفیں، غرض خواہشوں کا ایک پلندہ تھا جو میں ہاتھوں میں تھامے زندگی کے کسی خوب صورت موڑ کی منتظر تھی۔ میرا اُس سے مل پانا بہت مشکل تھا۔ وہ ہزاروں میل دُور اپنی دُنیا اور کام میں مگن اور میں گھرداری اور بچوں میں مصروف۔ ملاقات ہو بھی تو کیسے۔۔۔ بس اِک یاد، ایک نامعلوم

محبت کا دیا جلنے لگا تھا جو میری روح کو روشن کر رہا تھا۔ کبھی کبھی بہت ساری باتیں جن کی کوئی ضرورت زندگی کو نہیں ہوتی وہ زندگی کو پُر وقار اور شاندار بنانے لگتی ہیں۔ مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ شاید میں کچھ غلط کر رہی ہوں۔ شاید اپنے شوہر کے ساتھ دھوکہ۔ میں پھر سوچنے لگتی کہ میں تو صرف لفظوں اور حرفوں کے گھر بناتی اور ان میں رہتی ہوں۔ ان لفظوں سے جو نہایت بے ضرر ہیں، کسی کو کیسے دُکھ پہنچ سکتا ہے۔ خود کو مطمئن کر لیتی۔ پھر ایک دن میری بھیجی گئی نظموں کا اُس نے تحریری طور پر شکریہ ادا کیا۔ ایک خوب صورت خط، خوب صورت لفظ، جو زندگی دیتے ہیں۔ مجھے بھی خوشی ملی۔ وہ جو نایاب ہوتی جاتی ہے، ختم ہوتی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک سوچ شدت کے ساتھ موجود ہے کہ کسی بھی مرد اور عورت کے درمیان تعلق صرف غلط ہی ہو سکتا ہے یا گناہ ہی ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی دوسرے لوگ دوست نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ سینکڑوں ایسے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں، وفادار ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ وہ عاشق ہی ہوں اور اگر لفظوں کے ہیر پھیر میں کہیں عشق شامل ہو بھی جائے تو یہ بھی ضروری نہیں کہ عشق گناہ میں مبتلا کرے۔ یہ وضاحت اس لیے کر رہی ہوں کہ میرے اس تعلق میں محبت کا

گہرا احساس تو تھا مگر گناہ نہیں کہ نہ کبھی ملے، نہ آمنے سامنے ہوئے، نہ ایسی کوئی خواہش رکھی۔ کبھی موقع ملا تو ہلکی پھلکی گپ شپ کر لی۔

زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھے خط لکھا تھا تو بھلا نہال کیوں نہ ہوتی۔ میری لکھی گئی سو نظموں کے جواب میں یہ خط جیسے میں نے سنبھال کر رکھا۔ مگر فائدہ کیا، ہیرے موتی چھپانے کے لیے تھوڑی ہوتے ہیں یہ تو دکھانے کے لیے ہوتے ہیں کہ لوگ ہماری بیش بہا دولت سے متاثر ہوں اور میرے پاس تو سب سے قیمتی چیز یہی تھی۔ گُل خان کے خوب صورت خط۔ خط سے پہلے وہ نظم بھی تو پڑھیے جو میں نے لکھی تھی۔ پھر اُس کا جوابی خط آپ کو سُناتی ہوں۔ نظم:

میں کیا لکھوں

میں کیا لکھوں کہ گلشنِ دل گل و گلزار کرتے ہو
پرندوں سے، پہاڑوں سے، ہواؤں سے، سمندر سے
کناروں سے، فضاؤں سے جب بھی تم پیار کرتے ہو
حسین پھولوں کے نازک رنگ، تیرے ہونٹوں کی زینت ہیں
وہ خوشبودار جنگل اب بھی تیری پہلی چاہت ہیں
حروف بے اماں پہ جان دیتے ہو
وہ سارے لفظ جب گریہ لیے تیری ہتھیلی پہ اُترتے ہیں
تو کاغذ اور قلم سے حیرتیں پرواز کرتیں ہیں

میں کیا لکھوں
حسیں سنگلاخ بے آب و گیاہ
ویراں پہاڑوں میں اب بھی ڈھونڈتے ہو
وہ ساری خوشبوئیں
وہ ساری افسردہ فضائیں
کئی بے ربط جملے کئی بے رنگ لمحے
کہیں حسن و ادا کی آبشاریں
تیرے اندر معانی کی نئی دنیاؤں کو آباد
کرتے ہیں
میں کیا لکھوں
تری تحریر کے سارے ستارے
میری پلکوں پہ اُترے جاگتے ہیں
ترے لفظوں کے سائے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں
ترے احساس کی خوشبو میری سانسوں میں
بھرتے ہیں
مجھے چھو کر گزرتے ہیں
تیرے دلبر لفظ میرے بدن میں گنگناتے ہیں
تیرے بے باک لہجے کی سخاوت نے
سہانے خواب کی پریاں بہت سے یاد کے جگنو
میرے اندر اُتارے ہیں
کئی بے نام لمحوں میں تجھی کو سوچتے جانا
عجیب سی اِک حقیقت ہے
عجیب سی بے قراری ہے
میں کیا لکھوں
کہ دامن میں صنوبر کے کئی جنگل مہکتے ہیں
سرِ مژگاں زیارت کے کئی تارے چمکتے ہیں
کئی دن سے میری سوچوں نے کئی رنگ
بدلے ہیں
مگر میں کیا کروں
ہر راستہ تیرے پہاڑوں میں اُترتا ہے
شب بن کر میری آنکھوں میں ڈھلتا ہے
وہ لفظوں اور حرفوں میں نئی تعمیر کرتا ہے
میں کیا لکھوں
مجھے آنکھوں میں وہ تصویر کرتا ہے

میں نے نظم لکھ دی ہر چیز کا ہر ایک پر علیحدہ تاثر ہوتا ہے۔ اس پر کیا اثر ہوا، اُس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا۔ وہ اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ اُس کا بس چلتا تو مجھے اغوا کر کے لے جاتا۔ کہیں چھپا دیتا پھر اس دیوی کی پوجا کرتا۔ وقت اور حالات اُس کے ہاتھ میں نہیں تھے۔
وہ اکثر کہتا، کنول کاش میں تم سے شادی کر سکتا۔ وہ اکثر اِس خواہش کا اظہار کرتا اور برملا اپنی محبت کا اظہار کرتا۔ اُس کا پُر جوش رویہ مجھے اچھا لگتا۔ مگر میں اس سے زیادہ کی قائل نہیں تھی۔ بچوں والی عورت ایسی باتوں کا جواب کیسے دے سکتی ہے۔ مجھے اُس کی دیوانگی پہ ہنسی آتی۔ بالآخر اُسے سمجھ آئی کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ میں تو اختتام کی طرف چل پڑی ہوں۔
اُس کا خط تو پڑھ لیں۔
ڈیئر کنول!
بہت ہی پیاری، بہت ہی رومانوی، بہت ہی thought provoking،

بہت بہت symbolic نظم ملی۔ میں نے بار بار پڑھی۔ اس کی فوٹو کاپی بھی بنوالی۔

بعض اوقات خوب صورت، اچھی، قیمتی چیزیں چرالی جاتی ہیں۔ تخلیق کار کچھ ابنارمل یا پھر سپر ابنارمل لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ورنہ وہ تخلیقی عمل کیوں کریں؟ کچھ اور کام کریں۔ تم بخوبی آگاہ ہو کہ شاعری، افسانہ نگاری گھر پھونک تماشہ ہے۔ اِس آگ کو وہ تاپا رہتا ہے، سُلگتا رہتا ہے۔ نہ تو عنقا کی مانند جل کے راکھ ہوتا ہے اور نہ ہی جلنا چھوڑ دیتا ہے۔ بس جلتے ہی رہ جاتا ہے۔ ہزاروں برس سے لکھاری سُلگتا رہتا ہے۔ ہومر کو دیکھ لو کیا بنا اس عظیم شاعر کا۔ کھانے کو روٹی بھی نہ تھی۔ ایک لوہار کے گھر میں رہتا تھا۔ اور تم سپنے دیکھنے والی ہو۔ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والی۔ تمھاری نظم ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ اور یہ کہ خوش رہا کرو۔ لکھا کرو۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا پورا فائدہ اُٹھایا کرو۔ اور مجھ سے جنگ نہ کیا کرو۔

تمھارا اپنا۔۔۔

میں نے کچھ اور نظمیں لکھیں۔ پھر اُس کا جواب آیا۔

ڈیئر کنول!

ظالم کیا شاعری کی ہے۔ دل نکال لیا ہے۔ ایسی سوچ جگا دینے والی شاعری کہ انسان صحراؤں میں کھو جائے۔ میں سنبھل سنبھل کر پڑھتا ہوں۔ جستجو ہوتی ہے۔ میں ایک ایسے جنکشن پر آ گیا ہوں جہاں تم نے ایک گلشن سجا رکھا ہے۔ اور تم تو یوں لگتا ہے کہ بلوچستانی ہو۔ اور تم نے بلا دیکھے ایسا گہرا مشاہدہ کیا ہے کہ الفاظ میں تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ بہرحال میں تمھیں طویل خط لکھتا رہوں گا۔ میری بن کے رہو۔

محفل اُن کی ساقی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا

میری بننے کا مطلب ہے کہ اپنی آنکھیں، اپنی سوچ مجھے دے دو۔

میں دیکھوں تو تمھیں دُنیا کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لیے اپنی تنہائی مجھے دے دو

تمھارا اپنا۔۔۔

پھر تواتر سے اُس کے کئی خط ملے۔ میں خط لکھنے میں ہمیشہ کنجوس رہی۔ پھر ایک عورت ہونے کے ناطے مجھ میں اتنی جرأت ہی نہیں تھی کہ اُسے جواب دے پاتی۔ جواب میں کیا لکھتی۔ محبت تو میرے دل میں بھی تھی۔ اُسے اِس بات کا پتہ چل چکا تھا۔

ڈیئر کنول!

تم کیسے اچانک میری زندگی میں آ گئی ہو۔ سونامی کی طرح اور ایسی محبت کا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اکیسویں صدی میں کوئی دلربا داستانی محبت کرے گی۔ جانی والی، سموں والی۔ یوں لگتا ہے کہ تم کہیں کبھی مجھ سے بچھڑ چکی ہو۔ تمھارا نام مجھے اچھا لگا تھا۔ اپنا اپنا سا اور کنول۔۔۔ تمھاری نظم ملی تو مجھے بہت فخر ہوا۔

کسی بھی مرد کے لیے عورت کی محبت باعثِ مسرت ہوا کرتی ہے۔ چاہنے والی کی چاہت کو چاہنا، بہت اچھا اچھا سا لگتا ہے۔ اور مجھے یوں لگتا ہے کہ تم میری زندگی کی گواڑخ ہو۔ دل کی اتھاہ وادیوں میں حکمراں ششوب ہو۔

" I am glad that there are you in this world of ordinary people."

تمھارا اپنا----

ایک اور خط دیکھیں۔

ڈیئر کنول!

ایسے ہی بس تم یاد آتی ہو، خاموشی سے جیسے Slit سے روشنی گذر جائے، چُپ چاپ غیر محسوس، اور ہمارا تعلق خالصتاً ذہنی اور ادبی ہے یعنی کوئی کسی سے Demanding نہیں ہے۔ سوائے توجہ کے۔ اور غرناطہ کی ایک کہانی ہے کہ محبوبہ رقص کیے جاتی ہے اور وہ ستار بجائے جاتا ہے۔ خدا نے اُنہیں امر کر دیا۔ صدیوں سے نخلستانوں میں وہ یونہی جیے جاتے ہیں۔

بلوچستان کی حانی اور اُس کے عاشق شہ مرید کو بھی خدا نے امر کر دیا۔ دونوں جواں سال اُونٹ پر صحراؤں میں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

تمھاری خوب صورت شاعری کی راہ دیکھتا ہوں، بہت دنوں سے۔

تمھارا اپنا-----

خط تو اور بھی کافی ہیں جو میرے نام مجھے موصول ہوئے۔ کچھ دیر کو دل دھڑکا پھر خاموش ہوگیا۔ بہت سی نئی انوکھی باتیں اچھی لگیں لیکن وہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ جو اُس نے چاہا، جو اُس نے سوچا۔ یوں اس رشتے، اِس تعلق کے آگے بہت آگے بڑھ جانے سے پہلے میں نے اس کا اختتام کر دیا۔

زندگی میں بہت ساری کمی تو ہمیشہ رہتی ہے اور ضروری نہیں کہ زندگی میں وہ سب کچھ میسر بھی ہو جس کی ہم خواہش کریں۔ زندگی جہاں بہت کچھ دیتی ہے، وہاں بہت کچھ طلب بھی تو کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے اپنی موجودہ زندگی اور حالات سے بہت سی شکایات ہیں۔ بہت سی باتیں میری پسند اور مرضی کے مطابق نہیں ہیں۔ یہ تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ سو میرے حصے کا یہی جہاں ٹھیک ہے۔ میرے لیے مجھے کبھی زیادہ کا لالچ نہیں رہا۔ ایک ہی زندگی میں اور آخر کیا حاصل کروں گی۔

سوگل خان کی محبت میرے لیے صرف لفظی محبت رہی۔ عملی نہیں۔ کبھی کہیں کوئی کسک کوئی کمی تو رہتی ہی ہے۔ میں گل خان کی توجہ اور محبت کے لیے اُس کی شکر گزار رہوں گی۔ بس اُسے میں یہی دے سکتی ہوں۔ ہاں مگر محبت کا سونامی بہت کچھ بہا لے گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

(یادِ ماضی)

اور پھر بیاں اپنا

میں نے سنگھار میز کی دراز کھولی جس میں اہم کاغذات رسیدیں وغیرہ رکھی ہوتی ہیں ان کو الٹتے پلٹتے ایک نیلے رنگ کا لفافہ نکل آیا۔ اجنبی سی چیز لگا۔ ڈاک کا غیر استعمال شدہ لفافہ۔۔ کبھی ایسے لفافے اضافی طور پر خرید کر رکھے جاتے تھے تاکہ ضرورت پڑنے پر بندہ نہ دوڑا یا جائے مگر اب تو یہ دور آ چکا کہ بقول شاعر:

ایک مدت سے نہ قاصد ہے نہ خط ہے نہ پیام

خط کا زمانہ جیسے صدیوں پرانا ہو گیا حالانکہ اتنا پرانا نہیں ہے۔ خط کے جادوئی حسن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خط لکھنا، سجے سنورے لیٹر پیڈ منگانا یا اپنے نام سے چھپوانا یا کاپی کا صفحہ پھاڑ کر لکھنا، پوسٹ کرنا، جواب کا انتظار کرنا، جواب موصول کرنا میں ایک کرزمہ تھا۔

گھر کے بیرونی دروازے کے اندر پھینکے گئے نیلے لفافے کو اچانک دیکھ کر جو انہونی خوشی ہوتی تھی وہ ناقابل بیان ہے جو کوئی پہلے دیکھ لیتا یا پا لیتا وہ آج کی تازہ خبر کا اعلانچی بن جاتا۔

لفافہ چاک کرنا خط نکالنا اور پڑھنا جذبات سے بھرپور لمحے ہوتے تھے۔ یہ تو پتے کی لکھائی سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کس کا خط ہے اور کبھی اندازہ نہیں ہو پاتا تھا تو تجسس بڑھ جاتا۔ صاحب ثروت گھروں کے باہر لیٹر باکس لگے ہوتے تھے ان میں سے ڈاک گھر کے مرد یا ملازمین نکال کر پیش کرتے تھے

”میانوالی سے بڑے بھیا کی چٹھی ہے“

”لاہور والی پھوپھی جان کا خط ہے“

”چمن میاں کا خط ہے اللہ خیر کرے“

گھر کا پڑھا لکھا فرد اس قسم کے جملوں سے اطلاعی اعلان کرتا تھا ہم سے جو پچھلی نسل تھی یعنی ہماری ماؤں، ماسیوں والی نسل اس میں سب خط پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے تھے لیکن ہماری والدہ صاحبہ اور خالائیں سب پڑھی لکھی تھیں:

بات ہو رہی تھی خط کے زمانے کی

دردانہ نوشین خان

کسی دوست (سہیلی) کا خط، اس کا تو مزہ ہی الگ ہوتا تھا۔ چن چن کر اشعار لکھے جاتے تھے کہیں مشکل الفاظ سے دھاک جمائی جاتی تھی کہیں زبان زد انگلش ورڈز۔ کچھ گھریلو قسم کی سہیلیوں کے خطوط اپنے گھر آنگن کے کیمرے ہوتے تھے جیسے:

"صحن میں مرغیاں دانے چگ رہی ہیں صبح کام والیوں نے یہاں گندم پھٹکی تھی۔ میں منہ میں قلم لیے اوپر دیکھ رہی ہوں بالائی منزل کی کھڑکی سے چھوٹی بھابی کی زلفیں لہراتی دکھائی دے رہی ہیں ناریل کا تیل لگاتی ہیں بال بہت پیارے ہیں ماشااللہ"

ایک غم فراق کی ماری دوست تھی جس کے خط میں ہر فقرہ ادھورا ہوتا اور آگے پن سے ڈاٹس لگے ہوتے جیسے:

آسمان پر چاند ---- رات کی رانی کی مہک ---- اور سکوت --- یہ ڈاٹس شاید اس کے پوشیدہ آنسو ہوتے تھے یہ نہ سمجھے گا میرے غم فراق میں ٹک ٹک لگاتی تھی اس کا یک طرفہ محبوب باہر چلا گیا تھا یعنی ملک سے باہر---وہ ہوائی جہاز کی ڈرائینگ بہت کرتی تھی کیونکہ تب ایموجی ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ جب موبائل پر SMS کا دور شروع ہوا تو مجھے پہلی خوشی یہی ہوئی کہ اب اچھی گندی رائیٹنگ کا ٹنٹا ختم ہوا۔

لفافوں والے خطوط کے علاوہ بے پردہ کارڈ کے خطوط جن کو سارا ڈاکخانہ پڑھے تو پڑھ لے بچپن لڑکپن میں اباجی کے پوسٹ کارڈ آنا یاد ہیں جب وہ دور کے موضع جات میں تعینات ہوتے تھے وہ کارڈ بھیجا کرتے (وہ ضلع دار تھے۔)

پوسٹ کارڈ مہذب مرتب الفاظ میں لکھے جاتے تھے خیریت کی اطلاع خیریت کی دعا فرزند کو پڑھائی کی تلقین والدہ صاحبہ کو آداب بچوں کو پیار۔

محبوب کے نام خطوط ہی عموماً الگ ہی پہچان تھی لفافے پر بیل بوٹے بنائے ہوئے لفافے کے اندر کبھی مرجھائی پتیاں کبھی فوٹو عطر میں بسائے ہوئے کبھی آنسوؤں میں نہائے ہوئے کبھی خون مرغ سے لکھے ہوئے کبھی لپ اسٹک کے دھبے محاذ یا دور دراز تعینات نوجوان اپنی بیگمات کو جذبات بھرے خطوط لکھتے تو والدین کو عقیدت و محبت بھرے خطوط لکھتے ہر رشتے کے نامے کا اپنا ہی رنگ ہوتا تھا وہ رنگ جو بیک گراؤنڈ میوزک جیسا مدھر دھیما تیز یا شر انگیز ہوتا فوری اطلاعات کے لیے خطوط کا نہیں بل کہ ٹیلیگرام کا وسیلہ ہوتا تھا خطوط باطنی طور پر خیر کا سندیسہ ہوتے تھے مگر پھر ٹیکنالوجی کی ایسی ہوا چلی کہ لفافے خطوط نامے نامہ بر متروک ہو گئے۔

آیا نہ پھر کے ایک بھی کوچے سے یار کے
قاصد گیا نسیم گئی نامہ بر گیا

☆☆☆☆☆

کوفتے

ٹفن کھلتے ہی مہکتے، خوشبودار سالن نے ساجد عرف چھوٹو کی بھوک میں اضافہ کر دیا۔ استاد جمیل بڑے بڑے نوالے نگل رہا تھا۔

ساجد ہاتھ میں پلگ پانا لیے کھڑا تھا۔ اسے بھی بھوک تھی، وقت بھی کھانے کا تھا۔

اُستاد نے ابھی کام ذمّے لگا رکھا تھا۔ سو کام مکمل کرنے کے بعد اسے روٹی ملنی تھی۔ وہ بھی ساتھ والے تندور سے دال یا سبزی کے ساتھ۔ استاد جمیل اسے بغور دیکھ رہا تھا چھوٹے اِدھر آ۔ استاد جمیل ایک نرم دل آدمی تھا۔

جی استاد جی۔ ساجد لپک کر سامان رکھ کر تابعداری سے آیا اس کی نظر شوربے میں رکھے 2 عدد کوفتوں پر تھی، جو اس نے آج پہلی بار دیکھے تھے۔ کیا تھے؟ کیا ذائقہ تھا؟ اسے معلوم نہ تھا۔

وہ دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

اتنے میں استاد جمیل نے اسے پلاسٹک کی پلیٹ میں 2 کوفتے رکھ کر سفید پلاسٹک کا چمچ اس کی جانب بڑھایا۔

یہ کھا لے۔ پھر جا کر بھورے کے تندور سے سب روٹی کھا آ۔

ساجد کی جیسے دل کی مراد بر آئی تھی۔ اس نے بسم اللہ پڑھ کر کوفتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور کھانے لگا۔

اُستاد جی اس سالن کا نام کیا ہے؟ ساجد دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

اُستاد جمیل موچھوں کو بل دیتا مسکرا کر بولا۔

ان کو کوفتے کہتے ہیں یہ گوشت کا قیمہ بنا کر تیار ہوتے ہیں۔

ساجد نے ٹفن بند کیا اور ہاتھ دھونے چلا گیا۔

پھر آ کر باقی لڑکوں کو آواز دی۔

ایک لڑکا گاڑی کے نیچے گھسا تھا۔ دوسرا لڑکا ٹائر رکھ رہا تھا۔

ان تینوں کو پیسے دیکر روٹی کھانے بھیج دیا اور خود صابر کریانے والے کی دکان سے ٹھنڈی بوتل پینے چل دیا۔

رضیہ چار سال پہلے بیوہ ہو گئی تھی۔

اس وقت ساجد چوتھی اور زاہد پہلی جماعت میں تھا۔

جب نذیر مزدوری کرتے ہوئے اوپری منزل سے گر کر جاں بحق ہو گیا تھا۔

مانوں۔ رضیہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

2 مرلے کا ڈبے نما گھر کو بھی غنیمت جانتی تھی۔

کوئی آمدنی کا ذریعہ نہ تھا، جو جمع پونجی تھی کچھ عرصہ چلی چند ایک رشتہ داروں نے مقدور بھر ساتھ دیا۔ پھر ہاتھ کھینچ لیا۔ ساجد کو

فصیحہ آصف خان

پڑھائی کا شوق تھا۔ مگر حالات اجازت نہ دے رہے تھے۔ پانچ جماعتیں پڑھ چکا تھا۔ رضیہ نے اسے نذیر کے جاننے والے استاد جمیل کی ورکشاپ میں کام پر رکھوادیا۔ زاہد البتہ سکول جا رہا تھا۔ ابھی چھوٹا تھا، مگر ذہین تھا، اسے پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ رضیہ اسے پڑھا رہی تھی۔ پڑھانا چاہتی تھی۔ سو انھیں حالات کو دیکھتے ہوئے رضیہ نے گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ زاہد کے سکول سے آنے سے پہلے وہ دو گھروں کا کام کر کے آجاتی۔ اسے کھانا کھلا کر، سلا کر پھر ایک دو گھروں کا کام کرتی، کچھ ساجد ہر ہفتے پیسے لے آتا۔ یوں گزر بسر ہو رہی تھی۔

رات تینوں صحن میں چاندنی کے نیچے سوئے ہوئے تھے۔ پورے چاند کی راتیں تھیں۔ آج ہوا قدرے ٹھنڈی تھی۔ ساجد کو نیند نہ آرہی تھی۔ وہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ اماں_ اس بقر عید پر مجھے کوفتے بنا کر کھلانا، ساجد نے حسرت آمیز لہجے میں کہا، تو رضیہ چونک کر مسکرا دی۔

ہاں_ ہاں کیوں نہیں۔ رضیہ نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔ وہ جانتی تھی - یہاں چند گھروں سے چھچھڑوں اور ہڈیوں کے نام پر قربانی کا گوشت ملتا تھا۔ پھر قیمہ اور کوفتے_ کیوں نہیں بیٹا۔ ہم ضرور کوفتے کھائیں گے اب سو جاؤ۔

رضیہ نے برابر والی چارپائی پر ہاتھ بڑھا کر اسے تھپکی دی اور سونے کی تلقین کرنے لگی۔

ساجد کو پھر ان صرف دو کوفتوں کے کبھی کوفتے نہ کھائے تھے۔ اسے اب انتظار تھا تو صرف ''بقر عید'' کا۔

رضیہ کو گھروں میں کام کرنے کے دوران بہت کم گوشت کا سالن ملتا تھا۔ زیادہ تر سبزی اور دال ہوتی تھی۔ اس پہ بھی وہ اللہ کا شکر ادا کرتی۔ وہ کہاں روزانہ پکا سکتی تھی۔ جو بچا کھچا مل جاتا شکر کرتی۔ اس کی اپنی اتنی استطاعت نہ تھی کہ چند ماہ بعد بھی گوشت پکا سکتی۔ بس، چٹنی اور کبھی چنے منگوا کر پیٹ بھر لیتے تھے۔ مہنگائی اور غربت نے بچوں سے معصومیت اور خواہشات چھین لی تھیں۔ خواہشات کے حسرتوں کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

کھانے کے علاوہ بھی کئی طرح کے اخراجات تھے۔ جیسے تیسے کر کے وہ کبھی ادھار کر کے پورا کرتی یہی آس و امید تھی کہ بیٹے دائیں، بائیں اس کا سہارا بنیں گے۔ اللہ پہ توکل تھا۔

زندگی کے دن گزر رہے تھے۔ صبح سے شام کا چکر چل کہ بقر عید کا چاند نظر آگیا۔

وہ باہر دیکھتی، کہیں گائے، کہیں بچھڑے، بندھے ہوتے۔ آس، پاس سے بکروں کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ جسے اللہ توفیق دے وہ قربانی کر رہا ہے۔ اللہ قبول فرمائے اور بنا حسد کے دعائیں دیتی اور اپنے کام پر چلی جاتی۔ اسے ساجد کی فرمائش یاد تھی۔ دعا کرتی کہ اس کی خواہشیں پوری کر سکے۔ پوری ہو جائے۔ آمین۔

دیکھتے دیکھتے "بقرعید" کا بڑا دن آ گیا۔ سبھی گھی کا سامان لیے، چہروں پہ اطمینان اور خوشی کے رنگ تھے۔

رضیہ نے صاف ستھرے، دھلے دھلائے کپڑے دونوں بیٹوں کو پہنائے اور عید کی نماز پڑھنے مسجد بھیج دیا۔

کہ ان کے آنے تک وہ ایک دو گھروں کا کام کر کے آ جائے گی راحیلہ باجی کے ہاں ابھی قصائی نہ آیا تھا۔

انھوں نے کہا کہ وہ گوشت بھجوا دیں گی۔

رضیہ کام ختم کر کے گھر آ گئی۔ ساجد اور زاہد بھی آ گئے تھے۔

دوپہر ہو گئی۔ کہیں سے گوشت نہ آیا تھا۔

تینوں انتظار کر رہے تھے۔ رضیہ نے آخرکار تین آلو اٹھائے اور قتلیاں بنانے لگی۔ دل قدرے رو رہا تھا۔ دونوں بیٹے الگ اداس تھے۔ رضیہ انھیں تسلی دیتی رہی کہ کہیں نہ کہیں سے گوشت ضرور آئے گا۔ چار بجے آخرکار راحیلہ باجی کے گھر سے گوشت آ گیا۔ چار بڑی بڑی ہڈیاں، دو بوٹیاں، دو کلیجی، کے نام پر لفافے میں گوشت تھا۔

رضیہ نے شکر یہ کہہ کر وصول کر لیا۔

اماں_ اس گوشت کے کوفتے نہیں بن سکتے ۔ ساجد حسرت آمیز لہجے میں بولا۔

زاہد نے خاموشی سے بھائی کو دیکھا اور بولا شکر کرو یہ بھی مل گیا ہے۔

ساجد کو سخت مایوسی نے گھیرا ہوا تھا۔

اماں میں ابھی آیا، یہ کہہ کر بنا کہے تیزی سے اُٹھ کر گھر سے باہر چلا آیا۔ رضیہ اسے پکارتی رہ گئی۔

اماں_ جانے دو ابھی آ جائے گا۔ کوفتوں کا بندوبست کرنے گیا ہے۔ زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا تو رضیہ آہ بھرنے لگی

اماں__ یہ گوشت پکا لو، رات کو کھا لیں گے

زاہد کے کہنے پر اس نے لفافہ اُٹھایا اور گوشت دھونے لگی ساتھ ہی ربّ سے شکوہ کناں بھی تھی ۔

پھر اگلے ہی لمحے وہ اوپر والے کا شکر گزار ہونے لگی، گوشت چڑھا کر وہ دونوں ساجد کا انتظار کرنے لگے۔

زاہد دو بار باہر جھانک بھی آیا، مگر ساجد کا کچھ اتا، پتہ نہ تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ دونوں کی تشویش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دو گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔

ارے تو ساجد__ یہاں کیا کر رہا ہے؟ میرے ساتھ آ۔ اُدھر، بڑے لوگ گوشت بانٹ رہے ہیں۔

نوید جو محلے کا لمبا سا لڑکا تھا، ساجد سے بڑا تھا، ساجد کے چہرے پر مایوسی کی لہریں دیکھ کر اسے پاس آ کر بولا

کہاں_ ساجد بے تابانہ بولا

ارے اُدھر اس سڑک کے پار جو بستی ہے وہاں۔ میں بھی لے آیا ہوں۔ بہت سارا گوشت دیا ہے انھوں نے سارے محلے کے لوگ وہیں سے لا رہے ہیں۔

اچھا__ ساجد اندرونی خوشی چھپاتے ہوئے بولا

تو میرے ساتھ چل، نوید اسے لیے سڑک پار کر کے کافی دیر چلنے کے بعد انھیں لوگوں کا رش دکھائی دینے لگا۔

ساجد کی آنکھوں میں چمک آ گئی، وہ تقریباً بھاگتا ہوا وہاں تک پہنچا۔ جہاں لوگوں کا اکٹھ تھا۔ آنکھوں میں امید تھی، ہجوم تھا۔ مگر چہروں پر خوشی تھی۔ آس پوری ہونے کی امید تھی۔ ساجد بھی انہی میں شامل ہو گیا۔

دو بڑی گاڑیوں میں سے گوشت کے لفافے نکالتے آدمی ترتیب سے ساتھ دے رہے تھے۔

بڑے بڑے لفافے، گوشت سے پھولے ہوئے تھے، ساجد نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری۔ من کی مراد پوری ہونے میں چند لمحے ہی باقی تھے کہ اس کی باری آ گئی۔

اسے بھی ایک بڑا سا لفافہ تھما دیا گیا۔ ساجد کی خوشی کی انتہا نہ رہی - نوید بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ پہلے لے کر جا چکا تھا۔ سو باقی لوگ گوشت لیتے جاتے اور گھر کی راہ لیتے۔

واہ یار___ تجھے تو بڑا لفافہ مل گیا۔ نوید مسکرا کر بولا۔

شکریہ تیرا یار___ آ۔ گھر چلیں، ساجد اسے ساتھ لیے کندھے سے کندھا ملا کر گھر کی راہ چلے۔

ساجد کی لفافے پر گرفت مضبوط تھی، اور من ہی من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ دونوں سڑک پار کرنے لگے۔ نوید جلدی سے آگے بڑھا اور تیزی سے سڑک پار کر لی۔ ساجد رُک گیا۔ تیز رفتار گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

اے_ آ جا۔ نوید نے اسے سڑک کے پار سے اشارہ کر کے پکارا۔ حالانکہ ٹریفک بہت زیادہ تھی۔

اچھا_ کہتا ہوا ساجد تیز تیز قدم اُٹھاتے_ کہ سڑک کے درمیان میں ہی ایک تیز رفتار گاڑی نے اسے وہیں کچل ڈالا۔ ساجد گر گیا۔ خون تھا کہ تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ساجد آخری سانس لے رہا تھا گاڑی والا بھاگ گیا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ساجد کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

ساجد_ ساجد۔ نوید روتے ہوئے مسلسل اُسے پکار رہا تھا۔

کوفتے__ کوفتے___ ساجد کے آخری الفاظ نوید کے کانوں سے ٹکرائے۔

ہاتھ کو مضبوطی سے گوشت کے لفافے میں پھنسایا ہوا تھا۔ ساجد، نوید اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ لوگوں میں سے کسی نے ریسکیو کو فون کیا۔ وہ آ گئے۔ ساجد کے بے جان جسم کو گاڑی میں ڈالا۔ نوید روتا ہوا، سسکیاں لیتا اس کے ساتھ تھا۔

آس اور سانس کی ڈور ٹوٹ چکی تھی۔

حسرتیں بین کر رہی تھیں۔ آرزوؤں کے تمام بلند و بالا محل زمین بوس ہو چکے تھے۔

خواہشوں کی موت پر زندگی ٹوٹی ڈور تھامے بے رحمی سے مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

”کیا کبھی یہ دن بدلیں گے؟“

جھنگ کے ایک چھوٹے سے قصبے کی تنگ و تاریک گلیوں میں شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ بجلی حسب معمول غائب تھی اور فضا میں گھٹن کا ایک انجانا بوجھ تیر رہا تھا۔ گلی کے کونے پر واقع پرانی سی چائے کی دکان، جو کبھی قہقہوں سے گونجتی تھی، آج غیر معمولی سنجیدگی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

رحمت علی، جو پیشے کے لحاظ سے رکشہ چلاتا تھا، اپنی شکستہ سی کرسی پر بیٹھا چائے کے کپ کو یوں تھامے ہوئے تھا جیسے وہ اس کی آخری امید ہو۔ اس کی آنکھوں میں تھکن کے ساتھ ایک عجیب سی بے بسی جھلک رہی تھی۔

”سنا ہے پھر پیٹرول مہنگا ہو گیا ہے،“ اس نے دھیرے سے کہا، جیسے الفاظ بھی اس کے ہونٹوں پر بوجھ بن گئے ہوں۔

دکان دار کریم بخش نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، ”ہاں بھئی، اب تو لگتا ہے سانس لینا بھی مہنگا ہو جائے گا۔“

رحمت علی کے ذہن میں جیسے ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اسے وہ دن یاد آئے جب وہ صبح سویرے رکشہ لے کر نکلتا اور شام تک اتنا کما لیتا کہ بچوں کے لیے روٹی، کبھی کبھار سالن اور کبھی کوئی میٹھی چیز بھی لے آتا۔ مگر اب... اب تو سارا دن کھپ کر بھی ہاتھ میں کچھ نہ بچتا۔

”پہلے ہی مہنگائی نے جینا دوبھر کر رکھا تھا، اب یہ پٹرول کی قیمتیں ...“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

اسی لمحے ایک دبلا پتلا لڑکا، شاید بارہ تیرہ سال کا، دکان پر آیا۔ اس کے کپڑے میلے اور چہرہ اداس تھا۔

”چچا، ابو نے کہا ہے آدھا کلو چینی ادھار دے دیں، کل دے دیں گے پیسے،“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

کریم بخش نے کچھ لمحے سوچا، پھر بغیر کچھ کہے چینی تولنے لگا۔ رحمت علی نے اس بچے کو غور سے دیکھا اور اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔

”تمہارے ابو کیا کرتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ابو مزدوری کرتے ہیں، مگر آج کل کام کم ہے... کہتے ہیں سب چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں،“ لڑکے نے جواب دیا۔

رحمت علی کے دل پر جیسے کسی نے پتھر رکھ دیا ہو۔ وہ خود بھی تو اسی کشتی کا مسافر تھا۔ ایک ایسا مسافر جسے نہ کنارے کا پتا تھا اور نہ ہی سفر کے اختتام کا۔

گھر پہنچا تو اس کی بیوی، زینب، چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ خالی برتن اس کے

عاصم علی

سامنے پڑے تھے اور آنکھوں میں پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔
''آج کیا لائے ہو؟'' اس نے امید بھری نظروں سے پوچھا۔
رحمت علی نے خاموشی سے جیب سے چند سکے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ زینب کے چہرے کی امید ایک لمحے میں بجھ گئی۔
''یہ تو آٹے کے لیے بھی کافی نہیں ہیں... '' اس کی آواز کانپ گئی۔
''میں کیا کروں، زینب؟ پٹرول اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ آدھی کمائی تو وہیں نکل جاتی ہے۔ باقی میں گھر کیسے چلاؤں؟'' رحمت علی کی آواز میں بے بسی عیاں تھی۔
کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے ان کے بچے خاموشی سے ماں باپ کی گفتگو سن رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بھوک کا سایہ تھا، مگر زبانیں جیسے سل گئی تھیں۔
اسی رات رحمت علی چھت پر جا بیٹھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے، مگر اسے لگتا تھا جیسے یہ چمک اس کے نصیب میں نہیں۔ اس نے سوچا، کیا واقعی یہ ملک ان جیسے لوگوں کے لیے ہے؟ یا وہ صرف اعداد و شمار میں زندہ ہیں، حقیقت میں نہیں؟
اگلی صبح وہ پھر رکشہ لے کر نکلا، مگر اس بار اس کے دل میں ایک عجیب سا بوجھ تھا۔ سڑکوں پر گاڑیاں کم اور چہروں پر پریشانی زیادہ تھی۔ ہر کوئی جیسے اپنے اپنے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔
ایک مسافر نے رکشہ روکا اور کرایہ پوچھا۔ رحمت علی نے تھوڑی زیادہ رقم بتائی تو مسافر نے فوراً انکار کر دیا۔
''اتنا مہنگا؟ تم لوگ تو لوٹنے لگ گئے ہو!'' وہ جھنجھلا کر بولا۔
رحمت علی کے ہونٹوں پر ایک کڑوی مسکراہٹ آ گئی، ''صاحب، ہم نہیں لوٹ رہے... ہمیں لوٹا جا رہا ہے۔''
مسافر کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ رحمت علی وہیں کھڑا رہ گیا، جیسے اس کے الفاظ بھی اس کے ساتھ تنہا ہو گئے ہوں۔
دن گزرتے گئے، مگر حالات بدلنے کا نام نہ لیتے۔ پٹرول اور ڈیزل کی قیمتیں بڑھتی رہیں، اور غریب آدمی کی زندگی سکڑتی چلی گئی۔ اس کی خواہشیں، اس کے خواب، سب مہنگائی کی چکی میں پسنے لگے۔
شہر کی وہی گلیاں، وہی لوگ، مگر اب ہر چہرے پر ایک ہی کہانی لکھی تھی — بے بسی، تھکن اور ایک خاموش احتجاج۔
رحمت علی اب بھی ہر روز رکشہ لے کر نکلتا ہے، مگر اب اس کے دل میں امید کی جگہ ایک سوال نے لے لی ہے:
''کیا کبھی یہ دن بدلیں گے؟''
اور اس سوال کا جواب شاید اس کے پاس نہیں، نہ ہی اس شہر کے کسی اور غریب کے پاس... بس ہوا کے دوش پر ایک آہ کی صورت معلق ہے، جو ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید بوجھل ہوتی جا رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

وقت کا دروازہ

بابر امین ابر

عمران کی چاندی ہو چکی تھی۔ وہ منزلوں پہ منزلیں مارتا اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں پہنچنے کے لیے لوگوں کی عمریں نکل جاتی ہیں۔ اس وقت وہ پذیرائی کے تناور درخت کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھا اپنی کامیابیوں کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی صلاحیتیں اسے بہت جلد کمپنی میں اسے عام سے ملازم سے خاص بنا چکی تھیں۔ اس کے اشارے پر اس کا مالک بڑے بڑے کاروباری معاملات طے کرتا۔ جہاں عمران کی سوئی اٹک جاتی وہاں اس کی کمپنی کا ملازم ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔

اب بھی وہ بیٹھا ایک خاص فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے بغیر دیکھے ہی کال منقطع کر دی۔ اسے آج ایک اہم میٹنگ میں پریزنٹیشن دینا تھی۔ وہ اپنا ارتکاز منتشر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پھر سے اپنی توجہ فائل پر مرکوز کر دی۔ چند لمحاتی توقف کے بعد پھر موبائل فون کی بیل بج اٹھی۔ عمران نے موبائل فون کی سکرین پر جگمگاتا نام دیکھا۔

"اوہو! ایک تو یہ ماں جی بھی ناں صبر نہیں کرتیں۔" عمران نے اپنی ماں کا نام جگمگاتا دیکھ کر کہتے ہوئے کال منقطع کر دی۔

تھوڑی دیر بعد پھر بیل بجی۔ اب چوں کہ میٹنگ کا ٹائم ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے موبائل سائلنٹ کیا اور میٹنگ روم میں گھس گیا۔

اس نے وہاں پوری دلجمعی اور جوش و خروش سے پریزنٹیشن پیش کی۔ سب اس کا پریزنٹیشن پیش کرنے کا انداز اور آفیشل ورک سراہ رہے تھے۔

عمران متورم آنکھیں اور مرجھایا مرجھایا چہرہ لیے قبرستان میں موجود تھا۔ اس کی ماں کو آج سپرد خاک کیا جا رہا تھا۔ وہ مفلوک الدماغ بنا ماں کو منوں مٹی تلے سوتا دیکھ رہا تھا۔ اس کے دو ہمسایوں نے اس

کی ماں کو قبر میں اتار کر مٹی ڈال کر قبر برابر کر دی تھی۔ سب اس کی حالت کے پیشِ نظر تسلیاں دے رہے تھے۔ اس کی دل جوئی کر رہے تھے۔ وہ بس دھوپ میں بیٹھے الو کی طرح ہونق بنا ایک ایک چہرہ دیکھ رہا تھا۔ دنیا میں بس اس کی ایک ماں ہی تھی۔ اس کے سوا اس کا اور کوئی نہیں تھا۔
عمران نے اچھا کمانا کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ماں اکثر اس سے کہا کرتی تھی کہ میرے لیے بھی وقت نکال لیا کرو۔ وہ کہتا کہ ماں کام بہت زیادہ ہوتا ہے۔ آفس میں سب مجھے ہی دیکھنا پڑتا ہے۔ مالک مجھ پر اعتماد بہت کرتے ہیں۔
اس دن میٹنگ سے پہلے عمران کی ماں کی طبیعت بگڑنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کا جی بیٹھنا شروع ہو گیا۔ وہ عمران کو بلانے کے لیے بار بار اسے کال کرتی رہی لیکن عمران نے میٹنگ کو اہم گردانا۔ اسے احساس ہی نہیں ہو پایا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں دھکا لگا کر وقت کے دروازے کو بند کر چکا ہے۔ اب اس کے ذہن میں یہ خیال اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا کہ اس کی لاپروائی کا ہی یہ شاخسانہ تھا کہ اس کی ماں نجانے کتنی تکلیف کاٹ کر اور کیسے جاں سے گزری ہو گی۔
ایک دن وہ ایسے ہی باہر سے گھومتا گھر آیا تو اس نے ماں کی چارپائی کے سائیڈ ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل فون دیکھا۔ اس نے یوں ہی موبائل فون اٹھایا۔ موبائل فون آن کیا۔ بے خیالی میں اس نے کال لاگ دیکھا تو لاسٹ کال اسے ہی کی گئی تھی۔ کال ناٹ کنیکٹڈ کا سٹیٹس شو ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں اس مینیو پر ٹک سی گئیں۔ یہ وہی وقت تھا جب عمران نے اپنے ہاتھوں سے وقت کا دروازہ بند کیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے موبائل پکڑے، سر بازوؤں میں دبائے بیٹھا رو رہا تھا۔
عمران اب جب بھی اس کا موبائل فون بجتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بجلی کی سی سرعت سے وہ موبائل فون کی جانب لپکتا۔
ایک احساس کے تحت کہ وقت کا بند کیا دروازہ کھل سکے۔ لیکن اب ایسا ہو پانا کہاں ممکن تھا۔ وہ تو وقت کا دروازہ بند کر کے صدیوں آگے بڑھ آیا تھا۔ اب پیچھے پلٹ پانا ناممکن ہو چکا تھا لیکن یہ بات اس کا دل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔

☆☆☆☆☆

سرکس

اُس کا پُورا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا جو شہر میں ہونے والے دھماکے کے بعد اُس کے جسم کا حصہ بنے تھے۔ اگرچہ وہ اپنے خالق کی مکمل تخلیق کی صورت میں زمین پر اُترا تھا اور ایک صحت مند اور خوب صورت بچہ تھا۔ اُس کے والدین اُس کی پیدائش پر بہت خُوش تھے اور اُس نے ایک سہل اور بہترین زندگی گزاری تھی۔ وہ شاذونادر ہی بیمار ہوا کرتا اس لیے نوجوانی میں ہی، اُس کی پُرکشش اور بھرپور شخصیت تھی۔ سکول میں بھی، اُس کی خوبصورتی اور دلکشی کی وجہ سے سب اُس سے بہت پیار کرتے۔ دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اُس سے نفرت کرتا ہو یا اُس کی جانب تحقیر آمیز رویہ رکھتا ہو۔ وہ بہت ہی خُوش مزاج اور شائستہ بچہ تھا اور سب اُس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اپنے سکول اور کالج کے دنوں میں، وہ کئی آنکھوں کا تارا تھا اور اپنے والدین کا قابل فخر بیٹا بھی۔ یہ احساس ہمیشہ ہی اُس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا اور وہ اتنے سارے لوگوں کے پیار پر پھولے نہ سماتا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا، اُسے اپنی پُرکشش شخصیت اور خوب صورت وجود کا احساس ہوتا چلا گیا جو اُس کے فخر میں مزید اضافہ کرتا۔ لوگوں کی ہر وقت کی تعریف اور ستائش کی وجہ سے، اُس نے اپنے جسم اور شخصیت کو مزید نکھارنے اور قابل ستائش بنانے کے لیے زیادہ توجہ دینی شروع کر دی اور اُس میں جم جانے کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ وہ یونیورسٹی سے تعلیم پہلے ہی مکمل کر چکا تھا

حمزہ حسن شیخ

اور آج کل نوکری کی تلاش میں تھا۔ ایک دن، اُس نے اخبار میں ایک اشتہار دیکھا اور فوراً ہی نوکری کے لیے درخواست دے دی۔ اچھی تعلیم اور جاذب نظر شخصیت کی وجہ سے، اُسے نوکری مل گئی۔ اب اُس کا ہاتھ رقم کے استعمال میں کشادہ ہو گیا، اس لیے وہ باقاعدگی کے ساتھ جم جاتا تاکہ خود کو زیادہ سے زیادہ پُرکشش بنا سکے۔ اب اُس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ جم کے لیے مخصوص خوراک کھا سکتا تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہا تھا جو اُس کی شادی کی تیاریوں میں مگن تھے۔ وہ اُس کے لیے ایک خوب صورت لڑکی کی تلاش میں سرگرداں تھے جبکہ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بنانے کے لیے باڈی بلڈنگ میں مصروف تھا۔ وہ اپنی نوکری کے ساتھ ساتھ باقاعدگی کے ساتھ جم بھی جاتا۔ اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے، وہ اپنے والدین سے بہت اُنس رکھتا تھا اور اُس کے والدین بھی اُس سے بہت محبت کرتے تھے۔

ایک دن، وہ اپنے والدین کے ساتھ، شادی کی خریداری میں مصروف تھا کہ بازار میں ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ وہ بے ہوش ہو گیا اور ایک ہفتے کے بعد، جب اُس کی آنکھیں کھلیں تو وہ ہسپتال میں تھا۔ جبکہ اُس کے والدین، اُس کی آنکھیں کھلنے سے پہلے ہی منوں مٹی تلے دفن ہو چکے تھے۔ اُس کا پورا جسم پٹیوں سے بھرا ہوا تھا جو ایک لباس کا رُوپ دھار چکی تھیں۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اُس نے صرف انہی پٹیوں کا لباس ہی زیب تن کیا ہوا تھا۔ کئی ماہ تک، وہ ہسپتال میں رہا کیونکہ اُس کے جسم کا کوئی بھی حصہ کسی زخم کے بغیر نہ تھا۔ بم دھماکے نے بری طرح، اُس کے جسم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ سخت ورزشوں اور بہت کوششوں کے بعد گندھا ہوا اُس کا جسم، ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اُس کا گوشت ایسے بکھر گیا تھا جیسے کسی سرہانے کی کپاس۔ اُس کے جسم کے کچھ ٹکڑے، جسم کے ساتھ کسی علیحدہ اعضا کی طرح چپک گئے تھے اور وہ گوشت کے ایسے لٹکتے ہوئے کئی ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا جبکہ اُس کے جسم کے کچھ حصے ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے تھے۔۔ جیسے جیسے اُس کے زخم بھرتے جا رہے تھے، ویسے ہی ڈاکٹر اُس کے بارے میں جاننا چاہتے تھے کیونکہ اس پورے عرصے میں، کوئی بھی اُس کو ملنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ وہ اُن کو جواب دینے سے قاصر تھا کیونکہ اُس کا دماغ ہر قسم کی یادوں

سے آزاد ہو چکا تھا۔ اُس کے زخم بھرنے میں کئی ماہ لگ گئے لیکن اُس کے زخموں کے نشان انمٹ تھے۔ یہ تمام نشان اُس کے جسم کا ایسے حصہ بن گئے تھے جیسے کسی اُونی بلی یا کتے کے سمور ہوتے ہیں۔ صحت مند ہونے کے بعد بھی، اُس کو اپنے گھر یا خاندان کے بارے میں کوئی خیر خبر نہ تھی۔ کچھ رشتے دار، اُسے اپنے گھر لے گئے لیکن کچھ ماہ بعد، وہ بھی اُس سے اُکتا گئے کیونکہ اب وہ صرف ایک زندہ لاش تھا جو کچھ بھی سمجھنے، سننے یا بولنے سے قاصر تھا۔ اُس کے پاگل پن کے بارے میں یقین کے بعد، انھوں نے اُس کے گھر اور ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک پاگل انسان ہے اور اُسے کچھ بھی یاد نہیں۔ اس لیے انھوں نے اُسے اپنے گھر سے نکال باہر کیا۔ اب وہ سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا پھرتا اور وہیں پر ہی سو جاتا۔ کچھ لوگ اُسے فقیر سمجھ کر کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے دے دیتے۔ وہ بچوں کے لیے ایک تفریح تھا۔ وہ اُسے تنگ کرتے، وہ اُن کے سامنے بھاگتا جبکہ وہ بری طرح اُس کا پیچھا کرتے۔ سارے علاقہ اُسے ایک پاگل فقیر کے نام سے یاد کرتا جو تفریح کا ایک ذریعہ تھا۔ بچوں سے تنگ ہو کر جب وہ غصے کا اظہار کرنے کے لیے بالکل باڈی بلڈرز کی طرح اداکاری کرتا تو اُس کے جسم کے سارے لٹکتے ہوئے گوشت کے ٹکڑے، کسی اُونی بلی یا کتے کی اُون کی طرح بالکل سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ وہ اتنا خوفناک ہو چکا تھا کہ بہت سے بچے اُس کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے جبکہ کچھ اُس کو تنگ کرنے کے لیے زیادہ شور مچاتے لیکن وہ اتنا جان چکا تھا کہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے، ان شیطان بچوں سے چھٹکارہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس لیے جب بھی وہ ان شریر بچوں کے گروہ میں پھنس جاتا تو ان سے جان چھڑانے کے لیے کسی باڈی بلڈر کی طرح اداکاری کرتا۔ یہ نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ اُس کے لیے بھی ایک نیا کھیل تھا اور اس طرح وہ لطف حاصل کرتا۔ اُس کے دن رات، سڑکوں اور گلیوں میں گزرتے جو کہ بچوں اور بڑوں کے لیے ایک لطف آمیز تماشہ تھا۔ اُس کی زندگی پاگل پن سے بھرپور تھی۔

ایک دن، بچے اُس کو تنگ کر رہے تھے جبکہ وہ ایک باڈی بلڈر کی طرح اداکاری کر رہا تھا کہ سرکس کے کچھ لوگوں نے اُسے دیکھ لیا۔ انھوں نے ایسا عجیب و غریب شخص پہلی بار

دیکھا تھا۔ اُس کا پورا جسم زخموں سے بھرپور تھا اور ہر زخم کا اپنا الگ رنگ اور شکل تھی۔ اگرچہ اُس کا جسم بہت کمزور تھا لیکن خوب بنا سنورا ہوا تھا اور وہ باڈی بلڈرز کے سارے سٹائل سے واقف تھا۔ وہ اُسے سرکس لے گئے، اُسے خوب نہلا دُھلا کر صاف ستھرا کیا۔ انھوں نے اُسے پیٹ بھر کھانا دیا اور کچھ ہی دنوں میں، اُس کی کمزور صحت خوب بحال ہو گئی۔ انھوں نے اُسے باڈی بلڈرز والے سارے سٹائل سکھانے شروع کر دیئے اور اس کام کے لیے باقاعدہ ایک بندہ اُس کو ٹریننگ دینے لگا۔ کچھ دنوں تک، وہ ٹریننگ حاصل کرتا رہا۔ اُسے اس بندے سے اُنسیت ہو گئی جو اُس کا خیال رکھتا اور اُسے پیٹ بھر کھانا دیتا۔ کچھ دنوں بعد، انھوں نے سرکس میں اُس کے لیے ایک الگ شو شروع کر دیا۔ اب سرکس کے باہر اُس کی فوٹو کے ساتھ ایک بینر آویزاں تھا جس پر لکھا تھا: ”آؤ اور دیکھو ایک انوکھا انسان۔۔۔ جس کے جسم پر اُون اُگ آئی ہے۔۔۔ جس کے جسم کے کئی رنگ ہیں۔۔۔ آؤ اور دیکھو۔۔۔ صرف پچاس روپے کی ٹکٹ۔۔۔“ لوگ اُس کا فوٹو دیکھ کر اس جانب دوڑے چلے آتے۔ جب اُس کا شو شروع ہوتا تو اُس کا ہدایت کار سٹیج کے پیچھے کھڑا رہتا اور وہ اُس کی ہدایات پر عمل کرتا۔ جب وہ کسی باڈی بلڈر کی طرح اداکاری کرتا تو اُس کے جسم کے سارے کٹے پھٹے حصے بالکل سیدھے ہو جاتے۔ اُس کے جسم پر گوشت کے سارے ٹکڑے، چیتھڑوں اور گڑھوں میں بدل چکے تھے لیکن ابھی بھی اُس کے جسم کا حصہ تھے جو اُس کی اداکاری پر بالکل سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ وہ یہ شو دن میں ہر گھنٹے کے بعد کرتا اور اس کے بدلے، اُس کو کپڑے اور کھانا ملتا۔ وہ اپنے زخم پوری دُنیا کو دکھاتا اور لوگ نمک کی طرح پیسہ اُس کے زخموں پر چھڑکتے لیکن وہ ایک بے حس انسان تھا جو نمک کی اس شدت کو محسوس کرنے سے قاصر تھا جو بہت بری طرح اُس کے زخموں کو جھنجھوڑتا تھا۔ وہ پوری دُنیا کو اپنے زخم دکھاتا رہا جبکہ لوگ اُس پر کچھ پیسے پھینک کر اُس کے زخموں پر ہنستے اور کھلکھلاتے رہے۔ اگرچہ وہ ایک پاگل انسان تھا اور اُس کی ساری حسیات مر چکی تھیں لیکن بھوک کی حس ابھی بھی زندہ تھی جو روزانہ اُس کو اپنے زخموں کے تماشے پر مجبور کرتی۔

☆☆☆☆☆

تعفن

عمار نعیمی

کمرے کی ہوا میں سگریٹ کے دھوئیں، پسینے اور ایک نامعلوم سی اکتاہٹ کی بو رچی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی جو دو اجنبیوں کے ایک بستر پر ننگے ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے، اس کمرے کی دیواروں سے چپک گئی تھی۔

ندا آئینے کے سامنے کھڑی اپنی قمیص کے بٹن بند کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ ویرانی تھی جو برسوں پرانی لاوارث قبروں پر اُگی جھاڑیوں میں ہوتی ہے۔ بستر کی پشت سے ٹیک لگائے کامران اسے دیکھ رہا تھا۔ پچھلے تین سالوں میں ان کے درمیان جسمانی قربت تو درجنوں بار ہوئی تھی لیکن روح کی سطح پر وہ ایک دوسرے سے اتنے ہی دُور تھے جتنا ایک مردہ دوسرے مردے سے ہوتا ہے۔

''تمھارے شوہر کا فون بج رہا ہے۔'' کامران نے بے دلی سے کہا اور سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھالیا۔

ندا نے برش سے اپنے اُلجھے بالوں کو سیدھا کیا۔ ''بیٹے کو سکول سے لانے کا وقت ہو گیا ہے شاید اس لیے کال کر رہے ہیں۔ خود تو ہوں گے مصروف اپنی سیکرٹری کے ساتھ، انھیں کہاں فرصت کہ اپنی بیوی اور بچوں کا خیال رکھیں۔ ہونہہ'' اس کے لہجے میں ایک زہریلا طنز تھا جواب اس کی عادت بن چکا تھا۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر لٹکایا۔

''مجھے نکلنا ہے، بچوں کو چھٹی ہو گئی ہو گی۔''

وہ دروازہ کھول کر چلی گئی اور کمرے میں ایک بار پھر وہی اداسی چھا گئی۔ بالکل ویسی اداسی جیسی میت کو دفنانے کے لیے گھر سے اٹھانے کے بعد گھر کی در و دیوار پر چھا جاتی ہے۔ کامران نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے سینے پر ایک بھاری پتھر دھرا تھا۔ ہوس پوری ہونے کے بعد کا یہ وہ وقت ہوتا تھا جب اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگتی تھی۔ اس گھن، اس اندرونی کھوکھلے پن کو چھپانے کے لیے اس نے وہی کیا جو وہ ہمیشہ کرتا تھا۔

اس نے فون پر فیس بک کھولی اور تیزی سے ٹائپ کرنا شروع کیا:

''ہماری موجودہ نسل جس تیزی سے بے راہ روی اور بے حیائی کا شکار ہو رہی ہے، وہ لمحہ

فکر یہ ہے۔ یہ مادر پدر آزاد سوچ ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ ہم جانوروں کی سطح پر آ چکے ہیں۔ حقیقی سکون صرف پاکیزگی میں ہے۔ خدارا! اپنی نسلوں کو اس گندے کلچر سے بچائیں۔''

پوسٹ پبلک کرتے ہی اس کے اندر ایک عجیب سا جھوٹا سکون اتر آیا جیسے اس نے کوئی بہت بڑا مجاہدہ کر لیا ہو۔ اس نے کپڑے پہنے اور اپارٹمنٹ سے نیچے آ گیا کیونکہ اس نے بھی اپنی بیٹی کو سکول سے لینے جانا تھا۔

باہر زرد دوپہر کی دھوپ سڑکوں پر پگھل رہی تھی۔ شہر کے چہرے پر ایک عجیب سی تھکن اور اجتماعی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شخص کسی نہ کسی اندھیرے میں اپنا اپنا گناہ چاٹ رہا تھا اور اجالے میں پارسائی کی قے کر رہا تھا۔

کامران نے گاڑی سٹارٹ کی اور ریڈیو آن کر دیا۔ ایک معروف سیاست دان کی تقریر چل رہی تھی جو رو رو کر قوم کی ماؤں بہنوں کی عزت کی قسمیں کھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں ہوں ماؤں بہنوں کی عزت کا رکھوالا۔

کامران کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری۔ اسے یاد آیا کہ پچھلے ہی ہفتے پرائیویٹ گروپ میں (جہاں شامل ہونے کی ماہانہ فیس 3000 تھی اور جہاں صرف مشہور و معروف لوگوں کی لیک ویڈیوز سب سے پہلے آتی تھیں۔) اسی سیاست دان کی ایک مخالف پارٹی کی خاتون ورکر کے ساتھ نازیبا ویڈیو لیک ہوئی تھی جسے اس نے خود بلیک میل کرنے کے لیے بنوایا تھا۔

گاڑی ایک ٹریفک سگنل پر رکی۔ کامران کی نظر بائیں جانب فٹ پاتھ پر پڑی۔ وہاں کچرا چننے والا ایک لڑکا، غلاظت کے ڈھیر پر بیٹھا، اپنے سستے سمارٹ فون کی سکرین میں یوں گم تھا جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ کامران جانتا تھا وہ سکرین پر چلنے والے ننگے جسموں کو دیکھ رہا ہے۔

تھوڑا آگے ایک پرچون کی دکان تھی۔ حاجی صاحب (جن کے ماتھے پر سجدوں کا گہرا نشان تھا) کاؤنٹر پر جھک کر ٹافیاں لینے آئی ایک دس گیارہ سال کی بچی کو جس غلیظ نظر سے دیکھ رہے تھے وہ کامران سے چھپی نہ رہی۔

اس نے نظریں گھما لیں۔ دائیں جانب شیشے کے پیچھے ایک درزی کی دکان تھی۔ ماسٹر جی (جن کی زبان پر ہر وقت درود شریف رہتا تھا) ایک خاتون گاہک کا ناپ لے رہے تھے۔ انچ ٹیپ گھماتے ہوئے ان کے ہاتھ کی پشت غیر ارادی طور پر مگر ایک طے شدہ

مہارت سے عورت کے سینے سے رگڑ کھا رہی تھی۔ عورت نے بے بسی اور شرم سے نظریں جھکا لی تھیں لیکن ماسٹر جی کے چہرے پر ایک مردہ سی حیوانی طمانیت تھی۔

"یہ سارا معاشرہ ہی غلاظت کے ڈھیر پر بیٹھا ہے۔" کامران نے سوچا اور سگنل کھلتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ اس کی فیس بک پوسٹ پر لائکس اور کمنٹس کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ سب اس کی پارسائی اور گہری سوچ کی داد دے رہے تھے۔

اگلے چوک پر ایک سکول کا گارڈ، چھٹی کے بعد انتظار کرنے والے دو چھوٹے بچوں کو اپنے پاس سٹول پر بٹھا کر انھیں اپنے موبائل پر کچھ دکھا رہا تھا اور بچوں کے چہروں پر ایک عجیب سا خوف اور الجھن تھی۔

ایک حجام کی دکان کے شیشے سے کامران نے دیکھا کہ بال کاٹنے والا نائی کرسی پر بیٹھے کم سن بچے کے کندھوں پر جھکتے ہوئے اپنا نچلا دھڑ جان بوجھ کر بچے کی بازو سے مس کر رہا تھا۔

اس شہر کی ہوا میں سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں بظاہر سب نیک تھے سب کے موبائل فونز میں قرآنی آیات کے سٹیٹس لگے تھے لیکن کسی ایک کے پاس بھی دلی سکون نہیں تھا۔ ہر آنکھ میں ایک کھوکھلی اداسی تھی۔ وہ اداسی جو گناہ کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جسے چھپانے کے لیے انسان مزید گناہ کرتا ہے۔

کامران گاڑی موڑ کر اپنی بیٹی کے سکول والی سڑک پر آ گیا۔ چھٹی کا وقت ختم ہو چکا تھا اور سڑک پر ویرانی تھی۔ زرد دھوپ کی تمازت میں ایک دیوار کے سائے تلے سکول وین کھڑی تھی۔

یہ انکل مجید کی وین تھی۔ انکل مجید (سفید داڑھی والا وہ نیک اور شفیق بوڑھا جسے محلے کا ہر شخص عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ باجماعت نماز پڑھتا تھا اور بچوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتا تھا۔) کامران نے سوچا کہ آج وہ بیٹی کو خود گھر لے جائے گا۔ لہٰذا اس نے گاڑی وین کے پیچھے کھڑی کر دی۔

وین کے شیشے قدرے دھندلے تھے۔ کامران پیدل چلتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا تاکہ شیشہ بجا کر انکل مجید کو آگاہ کرے۔ وین میں پیچھے کوئی اور بچہ نہیں تھا۔ صرف فرنٹ سیٹ پر انکل مجید بیٹھے تھے۔

لیکن وہ اکیلے نہیں تھے۔

کامران کی نگاہ شیشے کے پار گئی اور وہیں جم گئی۔ اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی اور رگوں میں دوڑتا خون برف بن گیا۔

اس کا سانس حلق میں ایک کانٹے کی طرح اٹک گیا۔
انکل مجید کی گود میں کامران کی آٹھ سالہ بیٹی بیٹھی تھی ۔ اور اس متقی، پرہیزگار، سفید داڑھی والے بوڑھے کے کھردرے ہاتھ اس معصوم بچی کے جسم پر وہاں رینگ رہے تھے جہاں ان کا کوئی کام نہیں تھا۔
کامران کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ اس نے کانپتے، لرزتے ہاتھوں سے وین کا دروازہ کھینچ کر کھولا۔
دروازہ کھلنے کی آواز پر انکل مجید نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہ کوئی گھبراہٹ تھی، نہ کوئی خوف اور نہ ہی کوئی ندامت۔
اس کے چہرے پر وہی بے حس، کھوکھلی اور ابدی اداسی تھی جو اس پورے شہر کا مقدر تھی۔
اس نے بچی کو اپنی گود سے تھوڑا سا سرکایا، اطمینان سے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کامران کو دیکھ کر نہایت دھیمے اور پرسکون لہجے میں بولا:
"آیئے کامران صاحب...... بچی ذرا سردی سے کانپ رہی تھی۔ میں بس اسے دلاسا دے رہا تھا۔" وہ ایک لمحے کو رکا، پھر ڈیش بورڈ سے اپنا سستا سا موبائل اٹھا کر بولا: "ویسے صاحب..... میں نے ابھی فیس بک پر آپ کی وہ پوسٹ پڑھی۔ کیا کمال لکھا ہے آپ نے۔ سچ میں سر آج کل کی نسل بہت بے راہ روی کا شکار ہو گئی ہے۔ حیا تو جیسے ختم ہی ہو گئی ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔"
کامران کے ہونٹ سلے رہ گئے۔ اس سے ایک لفظ ادا نہ ہو سکا۔ اس کی نظر اپنی بیٹی کی آنکھوں پر پڑی۔
بچی خاموش بیٹھی تھی۔ وہ رو نہیں رہی تھی لیکن اس کی معصوم آنکھوں میں کوئی بچپنا باقی نہیں بچا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بالکل وہی خوفناک ویرانی اور وہی موت جیسی اداسی تھی...... جو کچھ دیر پہلے کامران نے ہوٹل کے کمرے میں ندا کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔
کامران کے کوٹ کی جیب میں رکھا موبائل ایک بار پھر وائبریٹ ہوا۔ اس کی پوسٹ پر ایک اور شخص نے کمنٹ کیا تھا: "بے شک کامران بھائی! آپ جیسے پارسا لوگ ہی اس معاشرے کا اثاثہ ہیں۔"
زرد دوپہر کی وہ کھوکھلی چھاؤں کامران کو نگلنے کے لیے آگے بڑھی اور وہ وہیں، اس وین کے دروازے پر اندر سے کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ ارد گرد شہر اپنی منافقت کے کفن میں لپٹا خاموشی سے مر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

پہلی بارش

عامر عباس ناصر اعوان

کئی دن ہو گئے تھے۔ گرمی جیسے شہر پر ٹھہر سی گئی تھی۔ فضا میں ایک بھاری پن تھا جو سانسوں تک کو تھکا دیتا تھا۔ سڑکوں پر گرد اڑتی تھی، اور وہ گرد صرف راستوں ہی پر نہیں تھی بلکہ لوگوں کے چہروں پر، ان کی آنکھوں میں، اور ان کے رویوں میں بھی کہیں نہ کہیں بسی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔ سامنے والے درخت کے پتے بھی جیسے تھک کر جھک گئے تھے۔ ہوا کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ ہر شے ساکت تھی۔ اس نے کھڑکی بند کرنا چاہی، مگر پھر رک گیا۔ شاید اسے کسی چیز کا انتظار تھا، یا شاید وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کس چیز کا۔

کمرے میں لوٹ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر پڑی پرانی ڈائری یونہی کھول لی۔ اس ڈائری کے صفحات پر وقت کی گرد جمی تھی۔ اس نے ایک ایک صفحہ پلٹا۔ کہیں خشک یادیں، کہیں بوسیدہ تحریریں اور کہیں ادھورے خواب لکھے تھے۔

چند صفحات پلٹے تو ایک سوکھا ہوا پتا گر پڑا۔ اس نے اسے اٹھایا، دیر تک دیکھتا رہا، پھر

بے اختیار مسکرا دیا۔ اس پتے میں بھی زندگی کی کوئی پرانی کہانی محفوظ تھی، جیسے وقت نے اسے محفوظ کر رکھا ہو۔

"پہلی بارش..."

یہ لفظ جیسے کہیں اندر جا کر ٹکرا گئے۔

وہ دن اسے اچھی طرح یاد تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، مگر آسمان پر اچانک بادل آ گئے تھے۔ ہوا میں ایک عجیب سی ٹھنڈک گھل گئی تھی۔ درختوں کے پتے سرسرانے لگے تھے جیسے وہ کسی آنے والی خوشی کی خبر دے رہے ہوں۔

"لگتا ہے بارش ہوگی!" اس نے کہا تھا۔

وہ باہر آ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی صاف نظر آ رہی تھی، جیسے کسی بچے کو اچانک چھٹی مل گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جو ہر شے کو روشن کر رہی تھی۔

"پہلی بارش ہے... یہ ہمیشہ خاص ہوتی ہے"، اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

وہ ہنس پڑا تھا "بارش میں بھی کوئی پہلی، دوسری ہوتی ہے؟"

وہ اس کی طرف مڑی تھی "ہوتی ہے... تم بس محسوس نہیں کرتے۔"

پہلی بوند اس کے ہاتھ پر گری تو وہ چونکا۔ واقعی اس میں کچھ مختلف تھا، یا شاید وہ خود مختلف ہو گیا تھا۔

"محسوس ہوا؟" اس نے پوچھا۔

وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ بس ہلکا سا سر ہلا دیا۔

بارش تیز ہو گئی تھی۔ وہ دونوں وہیں کھڑے بھیگتے رہے۔ نہ کسی نے اندر جانے کا کہا، نہ کسی کو جلدی تھی۔ جیسے وہ لمحہ ہی کافی ہو۔

"تمہیں پتا ہے؟" اس نے آہستہ سے کہا تھا "انسان کے اندر بھی ایک سوکھی زمین ہوتی ہے... پہلی بارش اسے ہرا کر دیتی ہے۔"

"اور اگر بارش نہ ہو تو؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی "پھر آدمی جیتا تو ہے... مگر ویسا نہیں رہتا۔"

وقت گزرتا گیا۔ موسم بدلتے رہے، مگر کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ بھی نہیں بدلتے... بس دور ہو جاتے ہیں۔

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا اس وقت کو یاد کر رہا تھا جب بارش ان کی خوشیوں کا حصہ تھی۔

اب وہی بارش خاموشی بن گئی تھی۔

اس نے کئی بار سوچا کہ وہ کہاں گئی ہو گی۔ کیا وہ بھی کبھی بارش دیکھ کر اسے یاد کرتی ہو گی؟ یا پھر... وہ اس کے لیے صرف ایک یاد بن چکا تھا؟

ڈائری میں اس کے لکھے ہوئے الفاظ اب

بھی موجود تھے۔ اس نے ایک صفحہ کھولا:

”محبت صرف ساتھ رہنے کا نام نہیں...
محبت کسی کے لیے دل میں جگہ بنانے کا نام ہے۔“

وہ لمحہ جیسے دوبارہ زندہ ہو گیا۔

شام ہونے لگی تو ہوا بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔ دور کہیں بادل گرجے۔

وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ نہیں جانتا تھا کیوں، مگر اس کا اندر کچھ کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

پہلی بوند گری۔

پھر دوسری... اور پھر بارش شروع ہو گئی۔

وہ باہر نکل آیا۔

بارش اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، مگر اس بار کچھ مختلف تھا۔ وہی بوندیں، وہی خوشبو...
مگر احساس ویسا نہیں تھا۔

”یہ پہلی بارش نہیں ہے...“ اس کے منہ سے خود بخود نکلا۔

اچانک اسے اس کی بات یاد آئی—

”محسوس کرنا سیکھو...“

اس نے گہرا سانس لیا۔ مٹی کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔ ہوا کے جھونکوں کو محسوس کیا۔
بوندوں کے گرنے کی آواز کو سنا۔

کچھ ہلکا سا بدلنے لگا تھا۔

اس نے آہستہ سے ہاتھ پھیلایا۔ بارش کی بوندیں اس کی ہتھیلی پر ٹھہرنے لگیں۔ وہ انھیں گننے لگا، جیسے ہر بوند ایک یاد ہو۔

زندگی بھی بارش کی طرح ہے۔ کبھی تیز، کبھی ہلکی، کبھی رکتی ہوئی، کبھی اچانک برستی ہوئی۔

ہم سب اپنی اپنی زمینوں کے مالک ہیں۔ کوئی زمین زرخیز ہوتی ہے، کوئی بنجر۔ مگر ہر زمین کو پہلی بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور شاید وہ پہلی بارش...... کوئی انسان، کوئی احساس، کوئی لمحہ ہوتا ہے۔

بارش تھم گئی۔

وہ اندر آیا، ڈائری بند کی، اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

درخت دھل چکے تھے، ہوا میں تازگی تھی۔ ہر شے جیسے نئی ہو گئی تھی۔

اور اس کے اندر...... کچھ نرم سا ہو گیا تھا۔

وہ دوبارہ اسی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا جہاں سے اس کہانی کا آغاز ہوا تھا۔ باہر کا منظر بدل چکا تھا، مگر اس کے اندر کی دنیا اب بھی کسی نہ کسی انتظار میں تھی۔

درخت اب ہرے تھے، ہوا میں نمی تھی، اور فضا میں ایک نرمی آ چکی تھی۔ مگر انسان کے اندر کا

موسم ہمیشہ باہر کے موسم جیسا نہیں ہوتا۔
اس نے سوچا......کیا پہلی بارش صرف یادوں میں ہوتی ہے؟ یا یہ واقعی ایک ایسا احساس ہے جو دوبارہ جنم لیتا ہے؟
اسی لمحے اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل بھی ایک زمین کی مانند ہے۔ کبھی خشک، کبھی تروتازہ، اور کبھی بارش کا منتظر۔
وہ آہستہ سے مسکرایا۔
اس نے ڈائری کھولی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، مگر دل میں ایک عجیب سی ہمت آ چکی تھی۔ اس نے ایک صفحے پر قلم رکھا اور لکھنا شروع کیا۔
اگر تم یہ خط پڑھ رہی ہو... تو شاید بارش کسی اور شہر میں بھی برس رہی ہو۔
مجھے یاد ہے تم کہا کرتی تھیں کہ انسان کے اندر بھی ایک سوکھی زمین ہوتی ہے......
آج میں نے محسوس کیا کہ میری زمین آج بھی تمہارے لمس کی منتظر ہے۔
تم نے مجھے سکھایا تھا کہ بارش کو صرف دیکھنا نہیں......اسے محسوس کرنا ہوتا ہے۔
اور آج...... میں نے محسوس کیا ہے......
پہلی بار۔
اس نے قلم رکھ دیا۔ آنکھوں میں نمی آ گئی۔
مگر یہ آنسو کمزوری کے نہیں تھے...... یہ احساس کی گہرائی کے تھے۔
کچھ دن بعد دروازے پر دستک ہوئی۔
اس نے دروازہ کھولا......
سامنے وہ کھڑی تھی۔
چہرہ تھوڑا سا بدلا ہوا تھا، مگر آنکھوں میں وہی چمک تھی۔
''تم......'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔
وہ مسکرا دی۔
''میں نے سنا تھا... پہلی بارش آئی تھی۔''
اس کا دل دھڑک اٹھا۔
وہ سمجھ گیا کہ کچھ رشتے موسموں کے محتاج نہیں ہوتے......وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔
وہ دونوں کھڑکی کے پاس کھڑے تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بوندیں دوبارہ گر رہی تھیں۔
اس بار بارش پہلے جیسی نہیں تھی......
کیونکہ اس بار......وہ اکیلا نہیں تھا۔
''اب سمجھ آیا؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔
وہ مسکرایا، ''ہاں... پہلی بارش کبھی ختم نہیں ہوتی... یہ صرف ہمیں دوبارہ تلاش کرتی ہے۔''
بارش جاری تھی......
اور اس بار......
یہ واقعی پہلی بارش تھی۔

☆☆☆☆☆

تطہیرِ دل

صفورا پرویز

آسمان کی سفیدی میں رفتہ رفتہ نارنجی رنگ مل رہا تھا، پرندے اپنے گھونسلوں سے نکل کر دنیا والوں کو اپنی چہچہاہٹ سے صبح کے آنے کا پیغام دے رہے تھے۔

چہرے اور جسم کو محسوس ہوتی صبح کی تازہ ہوا، پرندوں کی مدھم سے اونچی ہوتی چہچہاہٹ اور سورج کی چند شعاعیں ایک وجود بہت خاموشی اور گہرائی سے محسوس کر رہا تھا۔

فلزا کو محسوس ہوا کوئی اس کے سامنے آ کر بیٹھا ہے۔

وہ مراقبے میں آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی لیکن محسوس کر سکتی تھی کہ تارہ اس کے عین سامنے بیٹھا اسے دیکھ رہی ہے۔

"میں نے مہرماہ کو بلاک کر دیا ہے۔" اس نے فلزا کو ٹس سے مس نا ہوتے دیکھ منہ بناتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کیا۔

فلزا نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔

اس کی بھوری چمکدار آنکھیں اپنی چھوٹی بہن کی سوجھی ہوئی آنکھوں سے ملیں۔

اسے افسوس ہوا۔

"تمھیں ساری رات جاگنا نہیں چاہیے تارہ، ذہنی صحت متاثر ہوتی ہے۔"

وہ نرمی سے اسے کہتے ہوئے سانس اندر کھینچتے پھر سے آنکھیں بند کر گئی۔ میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں فلزا۔

تارہ نے سخت بیزاری سے اس کا گھٹنہ ہلاتے ہوئے کہا۔

فلزا نے ایک بار پھر سانس باہر نکالتے آنکھیں کھولیں۔

"زندگی بہت مختصر ہے تارہ، نفرتوں کا بوجھ دل میں اُٹھائے رکھنے کے لیے۔"

فلزا نے نظر آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

"کہ نفرتیں اگر دل میں پلتی رہیں تو نظر زندگی کی آدھی خوب صورتی دیکھنے سے قاصر ہو جاتی ہے۔"

تارہ نے آنکھیں گھمائی یہ سب کتابی باتیں ہیں فلزا، ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے بل کہ مہرماہ کو بلاک کر کے میں زیادہ اچھا محسوس کر رہی ہوں، آسمان مجھے بھی اتنا ہی خوب صورت نظر آ رہا ہے جتنا کہ تمھیں۔

تارہ نے فلزا کی طرف دیکھتے ہوئے آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔
یہ تارے اگر درمیان میں نا ہوتیں تو منظر اور صاف ہوتا۔
وہ اب اپنا کیمرہ آن کر کے تصویر لے رہی تھی۔
فلزا اس کے جواب پر مسکرائی۔
”نفرتیں دل سخت کر دیتی ہیں ان میں محبت پلنے میں وقت لگتا ہے
اور محبت کے بغیر زندگی کا مثبت اور خوب صورت رخ دکھائی نہیں دیتا۔“
اس نے تارہ سے موبائل لیتے ہوئے اسے سٹریک بھیجنے سے روکا۔
”لمحے جینا سیکھو تارہ ہر ایک کو ہر لمحے سے آگاہ رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔“
تارہ نے منہ بنایا۔
”تم بھی مہر ماہ کو دو چار باتیں سناؤ اور اسے بلاک کر دو۔“
فلزا نے تاسف سے اسے دیکھا۔
وہ صرف اس لیے اوپر آئی تھی۔
وہ اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے زمین پہ بچھا اپنا میٹ تہہ کرنے لگی۔
تارہ گہرے سانس لیتے اپنے آنسو روکنے کی تگ و دو میں تھی۔
”میں تمھاری طرح نا اتنی مضبوط ہوں نا میرا دل اتنی جلدی صاف ہو سکتا ہے۔“
اس نے میٹ پکڑتی فلزا کو دیکھتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا۔
”دل کے صاف ہونے کے لیے زبان کا صاف ہونا بے حد ضروری ہے تارہ، آنکھ، کان اور جسم جو دیکھتے سنتے ہیں وہ اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں ان کی اپنی یادداشتیں ہوتی ہیں یہ انسانوں کے رویے اور باتیں یاد رکھتے ہیں۔“
فلزا میٹ اٹھائے اس کے قریب آئی۔
تارہ ناسمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”جو بولو سوچ سمجھ کر بولو تارہ۔
تم اپنے اردگرد کی آوازوں پر قابو نہیں پا سکتی پر اپنی......
فلزا نے اسے کے سینے پر انگلی رکھی،
تم اپنی آواز بدل سکتی ہو تارہ،
جو بولو اچھا بولو،
خود سے جو کہو مثبت کہو،
ذہن خود مثبت ہوتا چلا جائے گا۔
اس طرح بناتے ہیں اپنے اردگرد مثبت ہالہ۔“
”تو جو لوگ کہتے ہیں اس کا کیا؟ جو تکلیف اپنے دیتے ہیں اس کا کیا؟
یہ باتیں سننے میں اچھی لگتی ہیں فلزا، ان کو زندگی میں عملی طور پر لانا بے حد مشکل ہے۔“
تارہ نے بے بسی سے کہتے ہوئے سیڑھیوں

کا رخ کیا۔
فلزا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اب وہ اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔
”سائیکالوجسٹ کہتے ہیں کوئی بھی تکلیف جو انسان محسوس کرتا ہے وہ بس نوے سیکنڈ کی ہوتی ہے، اس کے بعد کا ردعمل انسان خود منتخب کرتا ہے وہ خود اس لوپ میں رہنا چاہتا ہے اور بار بار تکلیف محسوس کرتا ہے۔ مسئلہ یا غلطی صرف دوسروں میں نہیں ہوتی تارہ ہم میں بھی ہوتی ہے۔“
وہ اپنی الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے اسے اس تکلیف کے لوپ سے نکالنا چاہ رہی تھی۔
تارہ بستر سیدھا کر کے واپس سونے کی تیاری میں تھی۔
”تمہارا مطلب ہے غلطی اس دھوکے باز لڑکی کی نہیں جس نے مجھ سے اتنی بڑی بات چھپائی مسئلہ میں ہوں۔“
وہ قدرے خفگی سے کہتے ہوئے چادر اپنے منہ تک لیتے لیٹ گئی۔
فلزا اپنا سوٹ صوفے پر رکھتے ہوئے بیڈ پہ اس کے پاس بیٹھی۔
”مسئلہ یہ ہے کہ تم اس معاملے کا مثبت رخ نہیں دیکھ رہی، مسئلہ یہ ہے کہ تم اس معاملے میں خیر نہیں دیکھ رہی، مسئلہ یہ ہے کہ تم خود تکلیف محسوس کرنا چاہتی ہو، یہ تمہارا اپنا انتخاب ہے تارہ۔“
فلزا نے چادر اس کے چہرے سے اتارتے ہوئے سنجیدگی سے کہا، اسے اب تارہ کا شکایت کرنا بیزار کر رہا تھا۔
تارہ خفگی سے اُٹھ کر بیٹھی۔
”کیا مثبت رخ ہے میرا رشتہ ٹوٹنے میں؟ کیا خیر ہے میری بیسٹ فرینڈ کا سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھے لاعلم رکھنے میں؟ ہاں؟ میرا رشتہ اور دوستی ایک ساتھ برے طریقے سے ٹوٹے ہیں اور تم مجھے ہی مسئلہ کہہ رہی ہو فلزا......
وہ چیختے ہوئے رونے لگی تھی۔
فلزا نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔
”کیا تم اب بھی چاہتی تھی کہ یہ رشتہ ہو جائے؟“
وہ بہت نرمی سے اس کی رائے جاننا چاہ رہی تھی۔
تارہ نے اس کے بازو سے سر لگائے نفی میں سر ہلایا۔
”کیا تم اب بھی مہر ماہ سے دوستی رکھنا چاہتی تھی؟“
”میں چاہتی ہوں اسے اپنے کیے پہ افسوس ہو، میں چاہتی ہوں وہ مجھ سے معافی مانگے۔“

اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی، آنکھوں سے
متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔
”زندگی ہماری چاہ کے مطابق نہیں چلتی،
بس یہی بات تمھیں اپنے دماغ میں ڈالنی
ہے۔ ہر انسان میں غلطی اعتراف کرنے کی
ہمت نہیں ہوتی، تو کیا جب تک اگلا افسوس
ظاہر نا کرے ہمیں اپنی حالت قابل افسوس
بنا لینی چاہیے؟
یہ ایک ہائی ویلیو انسان کا رویہ نہیں ہوتا،
یہ شے جسے ہم وائب کہتے ہیں نا
بہت قیمتی ہوتی ہے تارہ،
یہ منفی ہو جائے تو اپنے گرد بس منفی لوگ کھینچتی ہے
اور زندگی ناسک لوگوں سے بڑھ جاتی ہے
اور اگر یہ مثبت ہو جائے تو آس پاس
طمانیت اترنے لگتی ہے
کہتے ہیں نا
اچھے لوگ اچھے لوگوں کو ڈھونڈ لیتے ہیں“
یہ بس بات نہیں ہے یہ حقیقت ہے۔
خود کو بدلو تبدیلی خود سے شروع ہوتی ہے۔
جب زندگی کا لینز منفی سے مثبت کرو گی تو
سب بدل جائے گا۔“
اتنا آسان تو نہیں ہے یہ سب۔
تارہ نے اس سے الگ ہوتے ہوئے منمنائی۔
”اتنا مشکل بھی نہیں ہے“
فلزا نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

”دل کو نفرت کے بوجھ سے آزاد کر دو، ہر
جگہ فٹ ہونے کی جدوجہد کرنا چھوڑ دو،
جہاں ویلکم نا کیا جائے وہاں خوب صورتی
سے نکل جاؤ اور اپنی قدر و قیمت کا اندازہ
لوگوں کے رویوں سے مت لگاؤ،
بس۔“
تارہ نے اس کی طرف ناسمجھی سے دیکھا۔
”لوگ آپ کی قدر نہیں کریں گے تو پر کون
کرے گا؟“
”آپ خود۔“
وہ اس کے بال بگاڑتے ہوئے صوفے سے
اپنے کپڑے اٹھانے لگی۔
”یہ تو سیلف آبسیشن ہوئی۔“
تارہ نے منہ بنایا اسے فلزا کا جواب پسند نہیں
آیا تھا۔
”ام ہم، یہ سیلف کنیکٹیویٹی ہے۔
خود سے جڑے رہنے سے خود کو پہچاننے سے
اپنی ویلیوز کی قدر کرنے سے انسان حال
میں جینا سیکھ لیتا ہے وہ ماضی کا بوجھ اپنے
اوپر حاوی نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے،
زندگی مختصر ہے۔“
وہ کہتے ہوئے فریش ہونے چلی گئی تھی اور
تارہ سوچوں کے سمندر میں غرق خود کو تلاش
کرنے کے سفر میں روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

سنہری تتلی

آج کافی دن بعد اس نے اپنے گھر کے چھوٹے سے باغیچے کا رخ کیا تھا۔ سورج پورے آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ موسم سرما میں سورج کی موجودگی سکون دے رہی تھی۔ وہ سست روی سے گھاس پہ چلتے اپنے ہاتھوں سے سجائے اس باغیچے کو دیکھ رہی تھی جو اس کی توجہ چاہتا تھا۔ یکا یک اس کی نظر پھولوں پہ بیٹھی سنہری تتلی پر پڑی۔ سورج کی روشنی میں سنہرا رنگ مزید دمک رہا تھا۔ اس نے اس خوب صورت منظر کو دیکھا اور تتلی کی جانب بڑھنے ہی لگی تھی کہ اس کے سامنے کا منظر تبدیل ہوا۔ اس سنہری خوش نما تتلی کی جگہ مردار، مسلی ہوئی تتلی کا وجود موجود تھا۔ اور یک دم ہی ڈیڑھ ماہ پہلے کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ سنہرا اور سیاہ رنگ، ویسے ہی آزادی سے اڑتی ہوئی وہ کس طرح منٹوں میں مسل دی گئی تھی۔

وہ معمول کی طرح شام میں اکیڈمی سے واپس آ رہی تھی کہ گلی سنسان پڑی تھی۔ اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے پر اعتماد انداز میں وہ اپنے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی کہ گلی کے کونے میں ایک سیاہ اور سنہری آنچل دکھائی دیا۔ دبی دبی آوازوں کے ساتھ ایک ان دیکھے احساس نے اسے جکڑ لیا تھا۔

''کیا مجھے وہاں دیکھنا چاہیے؟'' خود سے ہی سوال کرتے اس کے قدم ڈگمگائے تھے۔

''نہیں نہیں، اگر کوئی خطرہ ہوا تو؟'' اپنے گھر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اسے پھر سے سسکیوں کی آواز سنائی دی تو اس نے ہمت کر کے اس جانب قدم بڑھائے۔ تھوڑی ہی دور سے اس منظر کو دیکھتے ہی اسے لگا تھا کہ اس کے قدموں کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی ہو۔ وہ دو لڑکے اب بے دردی سے اس وجود کو رسیوں سے باندھ رہے تھے۔ جگہ جگہ سے پھٹے کپڑے، چہرے پر ماسک ہونے کی وجہ سے ناقابل شناخت تھا لیکن اس لڑکی کے ہاتھ میں موجود گھڑی وہ پہچانتی تھی۔ وہ لڑکے تیزی سے اس وجود کو اٹھا کر اب کچرے کے ڈھیر کی طرف لے گئے تھے جو اب کچرے کے ڈھیر کا ہی حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن اس کی کھلی آنکھوں میں آس و امید کے جگنو مر چکے تھے۔ وہ کھلی آنکھیں اسے دیکھ چکی تھیں۔

طوبیٰ صدیقی

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں اور سن ہوتے دماغ کے ساتھ سب کچھ دیکھنے کے باوجود بھی کچھ کرنے کے قابل نہ رہی۔ چیخنے کی کوشش کی تو آواز نے ساتھ دینے سے انکار کیا، بیگ سے فون نکالتے ہوئے پولیس کو کال کرنے ہی لگی تھی کپکپاہٹ کی وجہ سے فون ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا جس سے وہاں موجود لڑکے جو اپنی کارروائی پوری کر کے آگے ہی بڑھ رہے تھے کہ اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کو دیکھتے وہ تیزی سے فون اٹھا کے دوسری گلی میں مڑی اور اپنے گھر کی طرف دوڑ لگائی۔

کئی ہفتوں تک اس حادثے کی وجہ سے بستر سے لگی رہی۔ کسی کو بتائے یا نہیں اسی کشمکش میں مبتلا وہ صدمے سے نڈھال اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ یونیورسٹی، اکیڈمی سب چھوڑ چھاڑ کر بس خود کو کمرے میں قید کر چکی تھی۔ آج چھ ہفتوں بعد ہمت کر کے اس نے باغیچے کا رخ کیا تھا لیکن ایک بار پھر سے وہی سسکیاں اور منظر اس کے سامنے گھوم گیا۔

وہ وہیں گھاس پر بیٹھی کر دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر خود کو اس دنیا سے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے رخسار تک کا سفر طے کیا۔

”تم اتنے دن سے یونیورسٹی کیوں نہیں آ رہی ہو؟“ اپنے قریب سے آتی اپنی دوست کی آواز پہ سر اٹھا کے اس نے بھیگی آنکھوں سے سامنے کھڑے وجود کو دیکھا۔

”بس ویسے ہی“، ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے ثمیرہ نے کہا۔

”ویسے ہی کیا مطلب؟ اور تم رو کیوں رہی ہو؟ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟“ شزا نے اس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”کچھ نہیں یار! بس ویسے ہی موڈ نہیں تھا یونیورسٹی جانے کا“، ثمیرہ نے ٹالنا چاہا۔

”موڈ ڈیڑھ ماہ سے نہیں؟ تمہارے گھر والے بھی پریشان ہیں آخر ہوا کیا ہے مجھے بتاؤ۔ آنٹی نے فون کر کے مجھے بلایا ہے کہ تم کچھ تو بتاؤ“، شزا نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

”میں تھک گئی ہوں، مجھے نہیں سمجھ آتی میں کیا کروں“، ثمیرہ نے روتے روتے تمام داستان کرب سنا ڈالی۔

”شکر کرو تم ان غنڈوں کے سامنے نہیں گئیں۔ تمہارے ساتھ بھی وہ کچھ کر سکتے تھے“، شزا نے شکر ادا کیا کہ وہ خود محفوظ رہی۔

”لیکن وہ لڑکی...... میں اسے نہیں محفوظ کر سکی“، اس کی آنکھوں کے سامنے وہ امید بھری آنکھوں کا عکس نظر آیا تو وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ارے تم پاگل ہو۔ رونے کے بجائے شکر ادا کرو کہ تمہارے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہیں

ہوا۔ سوچو اگر وہ لڑکے تمھیں دیکھ لیتے۔ خدانخواستہ تمہیں نقصان پہنچاتے...... اور تم نے کوشش کی تھی نا۔ ایسے واقعات میں ملوث ہونا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ بس تم بھول جاؤ آگے بڑھو اپنی زندگی میں''، شہزا نے اس کے قریب ہو کر بیٹھتے اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے سہارا دیا۔

شہزا کی باتوں کا اثر تھا کہ وہ اگلے دو تین روز تک اس کے سمجھانے کی وجہ سے کافی حد تک سنبھل چکی تھی اور اپنی روزمرہ زندگی کی طرف واپس آنے لگی۔ آج کافی دنوں بعد یونیورسٹی میں وہ اپنی دوستوں کے ہمراہ تھی کہ اسے ایک دم وہی گھڑی اسے کسی لڑکی کے ہاتھ میں نظر آئی تو وہ ٹھٹھک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''تم، تم ٹھیک ہو؟ تم یہاں کیسے؟'' وہ تیزی سے اس لڑکی کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھنے لگی۔ اس کا انداز اس قدر جارحانہ تھا کہ اردگرد کے لوگ بھی اس جانب متوجہ ہوئے۔

''ایکسکیوزمی؟ کون ہو تم؟ اور یہ کیا کر رہی ہو؟'' اس اجنبی لڑکی نے ثمیرہ کا انداز اور اپنے اردگرد لوگوں کو دیکھتے ہوئے خود کو اس سے چھڑایا۔

''سوری ریئلی سوری'' شہزا نے ہجوم میں سے جگہ بناتے ہوئے اس تک آئی اور معذرت کرتے ہوئے ثمیرہ کو وہاں سے کھینچ کر نکالا۔

''یہ کیا کر رہی تھیں تم؟''

''وہ۔۔ وہ لڑکی۔۔ وہی تھی اس کے ہاتھ میں موجود گھڑی...''

''اُف پاگل ہو تم۔ میں نے کہا تھا نا تم بھول جاؤ اسے۔ کب تک یوں اسے سر پر سوار رکھو گی'' ثمیرہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

اس کی جھنجھلاہٹ دیکھ کر اسے صدمہ ہوا، لیکن لفظوں شکایت کرنے سے انکاری رہے۔ وہ خاموشی سے اپنی کلاس کی جانب بڑھ گئی۔

xxxx

''تم۔۔۔ تم مجھے بچا سکتی تھیں۔۔ لیکن تم خود غرض نکلیں''، اپنے کمرے میں پڑھتے پڑھتے اس کی کانوں میں کوئی آواز گونجی تھی۔ اس نے اردگرد دیکھا لیکن اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

''تم نے اس دن بھی مجھے ایسے ہی نظر انداز کر دیا تھا''، اس کے سر جھٹکنے پر سماعتوں میں ایک آواز ابھری تو وہ چونک گئی۔

''کون ہے؟'' کپکپاتی ہوئی آواز اور لرزتے وجود کے ساتھ اپنے کمرے میں نظر دوڑائی۔

''میں ہوں...... ہاں میں ہوں جس کو تم بچا سکتی تھیں۔ تمھیں خدا نے موقع دیا تھا''، وہی مردہ آنکھوں کا عکس اس کے ذہن کے پردے پہ لہرایا۔

''دیکھو میں نے۔ کوشش کی تھی۔۔''، اس نے جیسے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی۔

''کوشش؟ نہیں نہیں تم صرف تماشائی تھیں... تم نے فقط میرا تماشا دیکھا''، وہ اور بھی کچھ کہہ رہی تھی کہ لیکن ثمیرہ کی سوچ لفظ ''تماشائی'' پہ اٹک چکی تھی۔ وہ کانوں پہ ہاتھ رکھتے اس آواز سے جان چھڑانے کی کوشش میں صوفے پہ بیٹھتی چلی گئی۔

××××

''کیا تم واقعی مجھے بھول گئی ہو؟'' گزرے دو دنوں میں وہ بخار میں مبتلا تھی۔ آج وہ دن بعد اس نے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھنا چاہا اچانک ہی اس کے کان میں کسی نے سرگوشی کی۔

''نہیں، نہیں۔۔ امی بابا، سب کہاں ہیں؟'' ثمیرہ کی آواز رندھ گئی۔

''کیا واقعی میں تمھیں یاد ہوں''، وہ ہلکا سا ہنسی۔

''تمھیں یاد ہے تم نے مجھے وہاں بندھا ہوا دیکھا... میری آنکھیں تمھیں دیکھ رہی تھیں... پھر بھی تم چلی گئیں۔ تم مجھے بچا سکتی تھیں''، اس لڑکی کا عکس ایک بار پھر سے اسے نظر آیا۔

'میں ڈر گئی تھی...... میں اکیلی تھی...... مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کروں''، ثمیرہ نے روتے ہوئے کہا۔

''اور میں بھی اکیلی تھی......'' آواز بھاری ہوگئی۔

''فرق صرف یہ تھا کہ میں مر رہی تھی''، اس عکس کی وحشت ناک آواز بلند ہو رہی تھی۔

''نہیں...... پلیز......'' ثمیرہ نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔

''اب مت روؤ...... اب تو سب ختم ہو چکا ہے۔ تم زندہ رہ گئی ہو۔ میں نہیں''، وہ اپنی صفائی میں مزید کچھ کہتی کہ عکس دھیرے دھیرے دھندلا گیا۔ ثمیرہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ زور سے چیخ چلاتی رہی پر اب وہ لڑکی وہاں موجود نہیں تھی۔

کمرے میں گہری خاموشی اتر آئی تھی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب تھیں۔ ماتھے پہ پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑکی کی طرف بڑھی۔ باہر شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر کھڑکی کے شیشے پر بیٹھی ایک سنہری تتلی پر پڑی۔

اس کا دل زور سے دھڑکا وہ لپک کر اس کی طرف بڑھی لیکن اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں وحشت اتر گئی۔ وہ سنہری تتلی بھی اسے مسلی ہوئی، بے جان دکھائی دے رہی تھی۔

ثمیرہ کے ہونٹ کپکپائے۔ وہیں فرش پہ بیٹھتی چلی گئی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اب وہ جان چکی تھی...... وہ لڑکی مر چکی تھی۔ اور اس کے اندر کی ثمیرہ بھی۔

☆☆☆☆☆

ننگے پاؤں

نعمان منظور

گاؤں کی وہ کچی گلی آج بھی ویسی ہے ـــ دھول سے اَٹی ہوئی، وقت کے تھپیڑوں سے تھکی ہوئی، اور خاموشی کے بوجھ تلے دبی ہوئی۔ صبح جب سورج کی پہلی کرن مٹی پر پڑتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے سنہری چادر بچھا ہو، مگر اس چمک کے نیچے چھپی ہوئی تھکن کو صرف وہی جانتا ہے جو اس گلی سے روز گزرتا ہے۔

اسی گلی میں ایک آواز ہوا کرتی تھی...... ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی، ہنستی ہوئی، جیسے زندگی خود مٹی کے ذروں میں گھل کر سانس لے رہی ہو۔

وہ لڑکی، صغریٰ۔

صغریٰ کے پاؤں ہمیشہ ننگے رہتے۔ نہ کبھی کسی نے اسے چپل پہنے دیکھا، نہ جوتے۔ اس کے پاؤں کی ایڑیاں پھٹی ہوئی تھیں، انگلیوں کے بیچ مٹی جمی رہتی، اور کبھی کبھار کوئی کانٹا بھی گوشت میں اٹکا رہ جاتا، مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ ان سب کو ایسے برداشت کرتی جیسے یہ سب اس کے وجود کا حصہ ہوں ـ جیسے درد بھی اس کا ساتھی ہو۔

مگر اس کی ہنسی کے پیچھے ایک خاموش اداسی تھی، جو کسی کو دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس کا گھر گلی کے آخری سرے پر تھا ___ ایک کچی دیواروں والا جھونپڑا، جس کی چھت بارش میں ٹپکتی اور گرمی میں جلتی تھی۔

اس کا باپ اللہ دتہ، شہر میں مزدوری کرتا تھا۔ صبح سویرے نکل جاتا اور رات گئے لوٹتا، اس کے چہرے پر گرد اور آنکھوں میں تھکن ہوتی۔ وہ بولتا تھا، شاید اس لیے کہ دن بھر کی مشقت نے اس کے لفظ بھی نچوڑ لیے تھے۔

صغریٰ کی ماں زبیدہ، ایک دائمی بیماری کا شکار تھی۔ اس کا جسم کمزور اور آواز مدھم ہو چکی تھی۔ وہ اکثر چارپائی پر لیٹی رہتی، اور صغریٰ اس کے پاس بیٹھ کر سا کے بال سہلاتی، وہ ماں نہیں، بچی ہو۔

"اماں، جب میں بڑی ہو جاؤں گی نا، تو آپ کے لیے دوائی لاؤں گی...... اور اپنے لیے جوتے بھی......" وہ اکثر معصومیت سے کہتی۔

زبیدہ مسکرا دیتی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو اُمید سے زیادہ بے بسی سے بھری ہوتی۔

گاؤں کے بچے جب سکول جاتے، ان کے پاؤں میں جوتے ہوتے، بجتے ہوتے، اور آنکھوں میں ایک انجانی سی خود اعتمادی۔

صغریٰ دروازے کے پیچھے کھڑی انھیں دیکھتی رہتی۔ کبھی وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑتی، کچھ فاصلے تک، پھر رُک جاتی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا راستہ الگ ہے۔

ایک دن اس نے اپنی سہیلی رابعہ سے پوچھا: "جوتے پہن کر چلنے میں درد نہیں ہوتا نا؟"

رابعہ نے حیرت سے کہا، "نہیں، کیوں ہو گا؟" صغریٰ نے مسکرا کر سر ہلا دیا، مگر اس کے اس میں ایک چبھن سی اُتر گئی۔

اس رات وہ دیر تک جاگتی رہی۔ اس نے اپنے پاؤں کو دیکھا۔ کھردرے، زخمی اور تھکے ہوئے۔ اس نے آہستہ سے انھیں اپنی چادر میں چھپا لیا۔ جیسے کسی سے شرما رہی ہو۔

دن گزرتے گئے، موسم بدلتے گئے، مگر صغریٰ کے پاؤں ویسے ہی رہے۔ ننگے، تھکے ہوئے، مگر چلتے ہوئے۔ پھر سردیوں نے دستک دی۔

ہوا میں ایک کاٹ تھی، جو ہڈیوں تک اُتر جاتی تھی۔ صبح کی دھند میں گاؤں کسی خواب کی طرح لگتا، مگر یہ خواب سرد اور بے جان تھا۔ زمین برف کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی، اور اس پر ننگے پاؤں کسی سزا سے کم نہ تھا۔

مگر صغریٰ بدستور نکلتی رہی۔

ایک صبح، جب دھند کچھ زیادہ ہی گہری تھی، اور ہوا میں عجب سی خاموشی تھی، صغریٰ نے دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔ اس کے پاؤں جیسے زمین کو چھوتے ہی کانپ اُٹھے، مگر اس نے پروا نہ کی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی رہی __ اسی گلی میں، جس نے اسے بچپن سے جوانی کی دہلیز تک پہنچایا تھا۔

اس دن اس کے قدم کچھ زیادہ ہی بھاری تھے۔ وہ گلی کے اس موڑ تک پہنچی جہاں اکثر وہ بارش میں کھیلا کرتی تھی۔ اس نے ایک لمحے کو رُک کر زمین کو دیکھا، جیسے کوئی پرانی یاد تلاش کر رہی ہو۔ پھر اچانک اس کا توازن بگڑا......اور وہ زمین پر گر گئی۔

کوئی آواز نہ آئی۔

کوئی چیخ نہ نکلی۔

بس ایک خاموش سا لمحہ، جو وقت کے سینے میں ہمیشہ کے لیے پیوست ہو گیا۔

جب لوگوں نے اسے دیکھا وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کے ننگے پاؤں مٹی سے اَٹے ہوئے تھے، مگر اس بار ان میں کوئی حرکت نہ تھی۔ ”سردی لگ گئی تھی......“ ”کمزوری تھی......“ لوگوں نے مختلف باتیں کیں۔

مگر کسی نے یہ نہ کہا کہ اس کے پاؤں بہت تھک گئے تھے۔

اس دن کے بعد گلی ویسی ہی رہی، مگر کچھ بدل گیا تھا۔ اب وہاں کوئی ننگے پاؤں نہیں دوڑتا، بارش آتی، کیچڑ بنتا، مگر قدموں کے نشان ادھورے رہ جاتے۔

زبیدہ کی آنکھیں اور بھی مدھم ہو گئیں اور اللہ دتہ کی خاموشی اور گہری

وقت گزرتا رہا۔

مگر بعض کہانیاں وقت کے ساتھ ختم نہیں ہوتیں، وہ زمین میں جذب ہو جاتی ہیں۔

اب بھی جب بارش ہوتی ہے، گاؤں کی وہی گلی بھیگ جاتی ہے۔ مٹی کی خوشبو اُٹھتی، اور کہیں دور سے یوں لگتا ہے جیسے کوئی ننگے پاؤں دوڑ رہا ہو، ہنس رہا ہو، زندگی کو آواز دے رہا ہو۔

مگر وہ صرف ایک گونج ہے __ ایک اداس، بھیگی ہوئی گونج، جو مٹی کے سینے میں دفن ہو چکی ہے۔

اور اس سے گزرنے والے کبھی کبھی اپنے پاؤں کو دیکھتے ہیں......اور بے اختیار انھیں جوتوں میں اور مضبوطی سے چھپا لیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

غزل

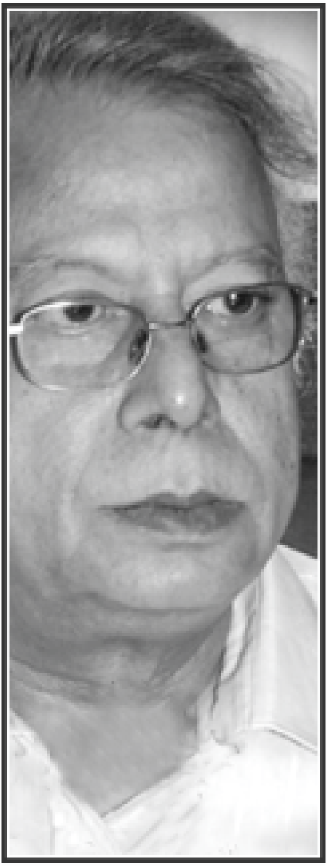

اندھیر رہ نہیں سکتا سدا خدائی میں
خدا گواہ بنے گا مری صفائی میں

چھنک اُٹھے ہیں مرے حلق میں وہی گھنگھرو
بس ایک سانس بچا ہے مری رہائی میں

یہ تنگ دل، مری دریا دلی سے اکتا کر
مری بڑائی گنیں گے، مری برائی میں

سروں پہ ٹوٹ پڑا کوہسار ابرِ رواں
ٹھہر سکا نہ مرا قافلہ ترائی میں

تن اپنی گرد میں پنہاں، دل اپنی سوج میں گم
شکستہ جاں نہیں خالد شکستہ پائی میں

خالد احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

در بہ در گریہ کناں، طالب درماں کیوں ہیں؟
تیرے عشاق گرفتارِ غمِ جاں کیوں ہیں؟

غزلیں

جلیل عالی

اک اک شے پیکرِ ندرت نہیں تو اور کیا ہے
یہ عالم عرصۂ حیرت نہیں تو اور کیا ہے
بدلنے پڑ گئے ہیں وشت کو دستور اپنے
ہماری جودتِ وحشت نہیں تو اور کیا ہے
بڑھے آتے ہیں تارے خود قدم لینے ہمارے
رمِ دل جانبِ رفعت نہیں تو اور کیا ہے
عدو ہم سے ہزیمت کا سبب موسم بتائے
یہ سیدھا مظہرِ خفت نہیں تو اور کیا ہے
یہ آپ اپنی قبا پر داغ دھبے پینٹ کرنا
کہو بیمار ذہنیت نہیں تو اور کیا ہے
کسی کی کوئی کب سنتا ہے سب تقریرتے ہیں
سروں پر حشر کی ساعت نہیں تو اور کیا ہے
بکھرنے کے قریں ہے سب دروبستِ زمانہ
دگرگوں دہر کی حالت نہیں تو اور کیا ہے
موافق پل میں عالی ہو گئیں وحشی ہوائیں
سراسر نصرتِ قدرت نہیں تو اور کیا ہے

اک شَر قصّہ لوبھ کلب کا
اک شُبھ افسانہ ہم سب کا
مصلحتوں کی باندی دنیا
عشق اسیر اپنے منصب کا
بھید بھنور ہے، کس کو خبر ہے
کیا ہو نتیجہ کون سبب کا
کبھی کبھی سارے کو بدل دے
دل سے گزر اک موجِ طرب کا
سوچ ، ارادہ ، منزل و جادہ
اپنا کیا ہے سب اُس رب کا
ذہن ہمارا دل کی دُھن پر
کیا کیا سپنے گائے کب کا
جب سے ترے سائے میں آیا
پوچھ نہ حال اس جان بلب کا
لفظ کہیں پیچھے رہ جائیں
ایسا کوئی شعر غضب کا
اتنی بڑی دنیا میں عالی
کوئی گوشہ اپنے ڈھب کا

غزل

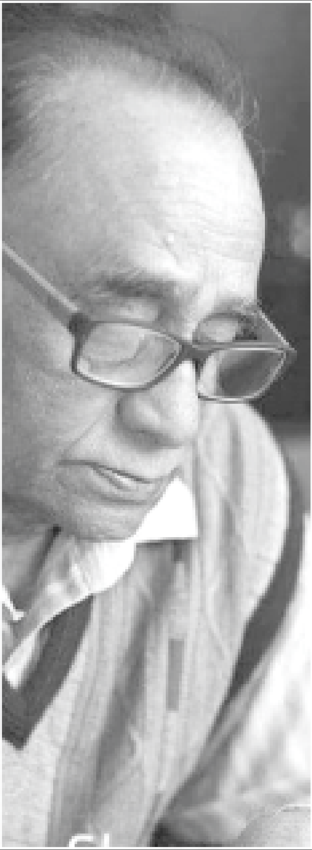

انور شعور

جو ایک دوسرے سے بھی انجان رہتے ہیں
اِس شہر کے گھروں میں وہ انسان رہتے ہیں

آنا نہ بھول کر بھی یہاں قیس تم کبھی
آبادیوں میں لوگ پریشان رہتے ہیں

آئے ہماری توبہ پہ اوروں کو کیا یقین
ہم خود اِس انقلاب پہ حیران رہتے ہیں

عشاق کے دلوں میں کہاں پھانس یا چُبھن
کانٹوں سے پاک صاف یہ گلدان رہتے ہیں

بچّوں کو ان کے حال پہ کب چھوڑتی ہیں مائیں
نظروں میں یہ شریر، یہ شیطان رہتے ہیں

کیسے تفکرات سے فرصت ملے شعور
سو مُخمصے دماغ میں ہر آن رہتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہرِ عمل میں بھاگتے لمحوں کے ساتھ بھاگ
خالد حصارِ فکر سے باہر نکل کے آ

غزل

انکشاف ذات کی تصویر ہے
خامہ مژگاں کی جو تحریر ہے

برسر پیکار تھا شب سے دیا
جاں فشانی صبح کی تنویر ہے

استقامت کے جواہر کھل اٹھے
کارفرما ناخن تدبیر ہے

آنکھ محروم تماشا ہو، تو پھر
بے بصر کو ہر کوئی تعزیر ہے

بے محل لفظوں سے بے کیفی ہوئی
بے ادب اسلوب کی تقصیر ہے

خانہ دل میں اندھیرا ہو گیا
صورت حالات پھر گھمبیر ہے

منصفی نے مصلحت کی راہ لی
کاغذی ہر عدل کی زنجیر ہے

اژدھام انہدام ذات میں
منہدم ہر صورت تصویر ہے

سانس لینا کار مشکل ہو گیا
حبس مانند دم شمشیر ہے

بات سننے سے بھی عاری ہے جہاں
یہ ریاض اب آپ کی توقیر ہے؟

سید ریاض حسین زیدی

غزلیں

ڈوب نہ جاؤں جونہی پانی پر اُترا
اِک دن ڈبکی ماری تب یہ ڈر اُترا

کبھی کبھی اِک لفظ کو بھی پھیلائے ہاتھ
اور کبھی بن مانگے ہی دفتر اُترا

گونگے بن کر بیٹھے تھے زہاد سبھی
چہک اُٹھے جب حلق سے اِک ساغر اُترا

خوف ذرا کم ہو تو یہ معلوم کریں
کون چڑھا سولی پر، کس کا سر اُترا

سارے شہر میں گھوما ہجر زدہ اِک چاند
آخرِ شب پھر جانے کس کے گھر اُترا

واعظ پر بھی روشن ہوں گے چودہ طبق
قعرِ لحد میں جونہی وہ گز بھر اُترا

اُڑنے لگے تھے خاورؔ میرے ہوش و حواس
کاندھے پر جب ایک ہما آ کر اُترا

خاور اعجاز

تحفہ ہے پہلی طوفانی بارش کا
تازہ ہونا زخم پرانی بارش کا

وہیں وہیں سے ٹوٹیں گھر کی دیواریں
جہاں جہاں ٹھہرا تھا پانی بارش کا

کس برتے پر فصل اُگائیں بارانی
کیا ہے بھروسہ آنی جانی بارش کا

رستے میں درویش کی کٹیا مِل جانا
ایک تدارک ہے امکانی بارش کا

پل میں ساون بھادوں پل میں مطلع صاف
ٹھیک نہیں کچھ پاکستانی بارش کا

جا برسی ہے ایک پہاڑی چوٹی پر
دم خم تو دیکھو میدانی بارش کا

دل میں سرسبزی و شادابی خاورؔ
فیض ہے تم پر اِک انجانی بارش کا

غزل

اشک بیانی کر دیکھیں
آگ کو پانی کر دیکھیں

کر کے دل میں دفن اسے
غم لافانی کر دیکھیں

کب تک اُس کی مانیں ہم!
اب من مانی کر دیکھیں

رونق راس نہیں دل کو
پھر ویرانی کر دیکھیں

اِک دن زلفِ جاناں میں
دل زندانی کر دیکھیں

خود کو ڈال کے مشکل میں
کچھ آسانی کر دیکھیں

بے چینی سی ہے گھر میں
نقل مکانی کر دیکھیں

اپنی یاد میں آج نسیم
مرثیہ خوانی کر دیکھیں

کیا پایا ہے دانش سے
اب نادانی کر دیکھیں

اُس کی یادوں ہی سے ہم
شام سہانی کر دیکھیں

تج دیں اُس کے لئے خود کو
یہ قربانی کر دیکھیں

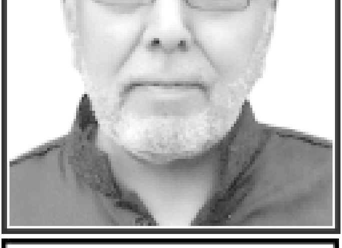

نسیم سحر

غزل

کشادہ دلاں کو بھی جا اب ہے مشکل
کریں ذکر احوال کیا، اب ہے مشکل

کہاں تک کرے کوئی وحشت نوازی
یہاں دشت وصحرا میں جا، اب ہے مشکل

ہمہ وقت رہنے لگا وردِ وحشت
کہ آسودہ رہنا ہوا اب ہے مشکل

ہمیں مت سناؤ، سبق زندگی کے
گراز بر ہیں تم کو، تو کیا اب ہے مشکل

گلی آ لگی جن مکانوں کے سائے
وہاں سے گزرنا مرا اب ہے مشکل

یہاں سانس بھر کی ہوا رہ گئی ہے
سو تارِ نفس کھینچنا اب ہے مشکل

بدن میں لہو کی چتا جل رہی ہے
دلا! تیرا کُھل کھیلنا اب ہے مشکل

وہ در میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہے
مگر لوٹ جانا مرا اب ہے مشکل

مسافت نے باندھے نہیں پاؤں میرے
یہ ڈگمگ قدم تھامنا اب ہے مشکل

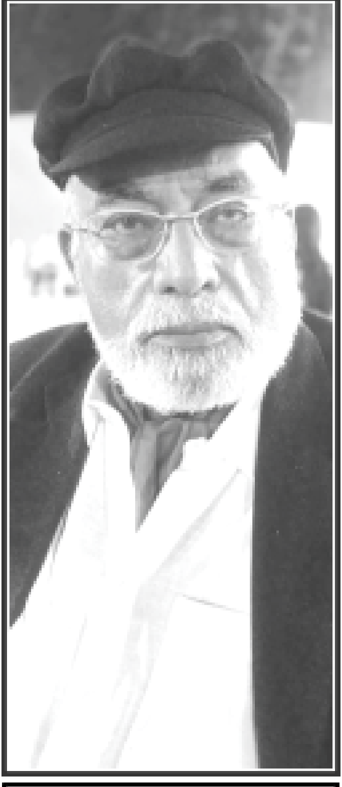

طارق بٹ

غزل

نقرئی پاؤں حُجرابوں سے نکل آتے ہیں
چاند سے چہرے نقابوں سے نکل آتے ہیں

پھر اُچک لیں گے ہمیں، بیچ میں سرمایہ دار
گر وڈیروں سے، نوابوں سے نکل آتے ہیں

سیر گاہوں میں سرِ شام ہَوا چلتے ہی
کتنے گُل چہرہ، گلابوں سے نکل آتے ہیں

ہم بھی دیکھیں گے سرِ حشر، شفاعت اُن کی
کس طرح لوگ عذابوں سے نکل آتے ہیں

آؤ کچھ دیر کہیں بیٹھ کے گپ شپ کر لیں!
آؤ کچھ دیر حجابوں سے نکل آتے ہیں

مری بک شیلف میں ہیں گوشہ نشیں، جانِ انیس!
رول ماڈل، جو کتابوں سے نکل آتے ہیں

اِک طلسماتی کہانی کے وہ کردار ہیں ہم
بَن کے تعبیر، جو خوابوں سے نکل آتے ہیں

حرفِ آخر کی طرف جب بھی کبھی بڑھتا ہوں
کچھ سوالات، جوابوں سے نکل آتے ہیں

چائے خانے ہوں کہ ڈھابے، یہی مے خانے ہیں
غم غلط کرتے ہیں، ڈھابوں سے نکل آتے ہیں

پھر سے لوٹا دیئے جاتے ہیں اسی صحرا میں
جب بھی ہم لوگ، سرابوں سے نکل آتے ہیں

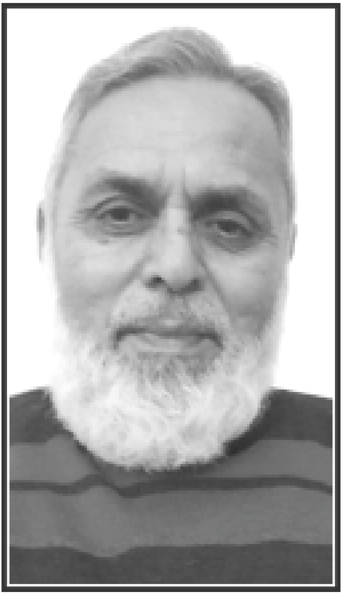

محمد انیس انصاری

غزل

رُکا ہوں آ کے کہاں، وحشت بھی نہ دریا بھی
بچھڑتا جاتا ہے اے عشق تیرا رستہ بھی

کہاں پہ جانا تھا ہفت آسمان سے آگے
یہیں چٹائی تھی میری، دھرا تھا پیالہ بھی

مکالمہ تھا مرا دوپہر کے سورج سے
یہ کیوں چلا مرے ہمراہ میرا سایہ بھی

وہاں کُھلے ہی نہیں کیمرے کے لینز مرے
سنور رہا تھا جہاں منظرِ شکستہ بھی

تُو میرے سونے سے مٹی اتارتا بھی کبھی
تجھے تو دیدہ وری کا بہت تھا دعویٰ بھی

نہ راہرو بھی، نہ بستی، نہ کوئی گھاٹ یہاں
اجاڑ ایسے تو کرنا نہیں تھا ڈیرہ بھی

یہ کس امنگ میں دریافت آسمان کیا
"پلٹ کے دیکھا تو اُڑتی تھی گردِ فردا بھی"

تماش بینوں میں طاہر وہاں پہ میں بھی تھا
جہاں پہ میرا لگایا گیا تماشا بھی

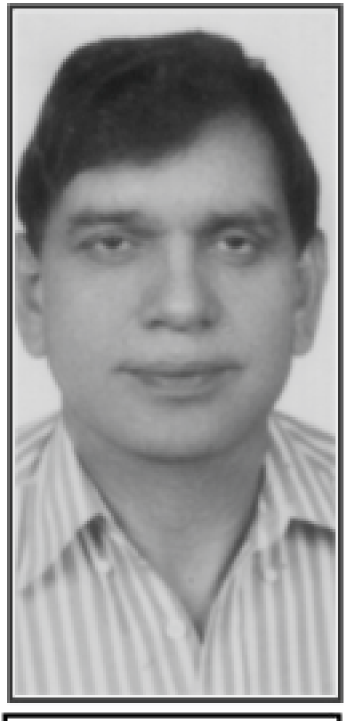

قیوم طاہر

غزل

منتظر کب سے ہیں تمھارے لیے
ہار گل دستے اور غبارے لیے

منہدم ہو چکا ہوں میں کب کا
آپ اب آئے ہیں سہارے لیے

ہے اگر کائنات اتنی بڑی
تنگ کیوں ہو گئی ہمارے لیے

پیڑ گرنے کی دیر ہوتی ہے
لوگ چڑھ دوڑتے ہیں آرے لیے

تم بھی کس شہرِ کور چشماں میں
بانٹنے نکلے ہو ستارے لیے

اپنی پوری نہیں پڑی راحت
کاش کر سکتا کچھ تمھارے لیے

راحت سرحدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یوں نہتوں کو نہ بھڑکاؤ خُدارا خالد
ہم میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ مر دیکھیں گے

غزل

جب ترے در پہ باریابی تھی
کامیابی ہی کامیابی تھی

منزلیں خود صدائیں دیتی تھیں
جن دنوں تیری ہمرکابی تھی

میں نے چہرے لکھے تھے لوگوں کے
میری تحریر کب نصابی تھی

ایک اک بات یاد رکھتا تھا
بس طبیعت ذرا حسابی تھی

میکدے جس پہ رشک کرتے تھے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی تھی

میں بھی تھک ہار کر نہیں بیٹھا
میری منزل بھی کچھ سرابی تھی

دل نے ہر اک پہ اعتبار کیا
میرے دل میں یہی خرابی تھی

اس کے ہاتھوں میں تھا گلاب کا پھول
اس کی رنگت بھی کچھ گلابی تھی

میری چپ میں سوال تھے کتنے
اس کی حالت بھی لاجوابی تھی

سارے گھر میں تلاش کرتا رہا
اور مرے ہاتھ میں ہی چابی تھی

حلقۂ چشم سے کھلا باقی
یہ گزرگاہ جیسے آبی تھی

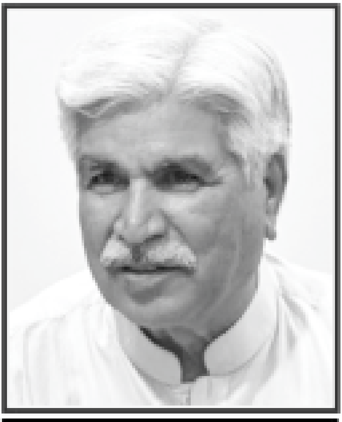

باقی احمد پوری

غزل

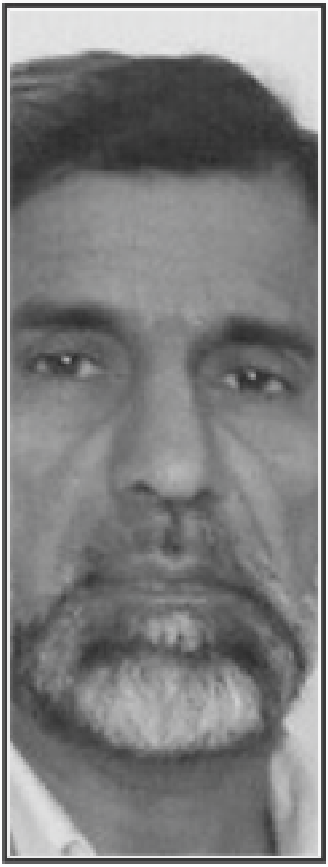

درد جو ہم نوائے تازہ ہے
خوشبوئے زخم ہائے تازہ ہے

پی رہی ہے لہو چراغوں کا
شہر میں جو ہوائے تازہ ہے

پیش رو اتنے شب نواز نہ تھے
جس قدر یہ ضیائے تازہ ہے

روز ہی پیڑ کٹ رہے ہیں مرے
روز ہی اک بلائے تازہ ہے

ان سفینوں کی خیر ہو جن کا
ناخدا ، ناخدائے تازہ ہے

کیا کوئی اس طرف سے پھر گزرا
دشت میں نقشِ پائے تازہ ہے

خورشید ربانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد وہ تھکن تھی کہ تہِ سایۂ مژگاں
دیوارِ خمیدہ کی طرح بیٹھ گیا میں

غزل

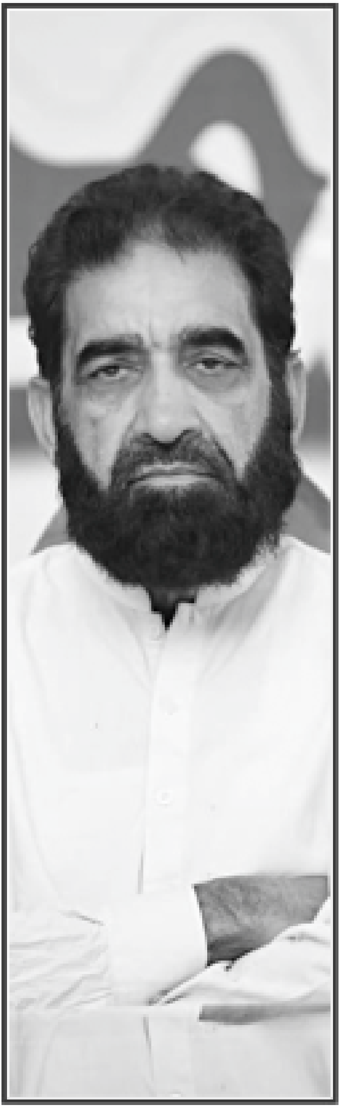

سعد اللہ شاہ

آیا جو حال فردا معانی میں رہ گیا
ماضی کا سارا لطف کہانی میں رہ گیا

اک چاند تھا کہ چھپ گیا بادل کی اوٹ میں
خوشبو کا جھونکا رات کی رانی میں رہ گیا

معصومیت چلی گئی بچپن کے ساتھ ہی
طاقت کا سارا زور جوانی میں رہ گیا

اس سے بچھڑ کے شعر بھی دولخت ہو گیا
وہ کیا کرے جو مصرعۂ ثانی میں رہ گیا

جو کچھ تھا میرے شعر میں اس پر نہیں کھلا
وہ تھا عروضی عیب زمانی میں رہ گیا

آزاد ہو کے سو گئے آزادیوں میں سب
جاگے تو خواب نقل مکانی میں رہ گیا

تکنے چلا تھا چاند کو جو سعد جھیل میں
اپنا ہی عکس دیکھ کے پانی میں رہ گیا

اے سعد سعدی ہے اس کی نہ مانی تو
اک المیہ شگفتہ بیانی میں رہ گیا

غزل

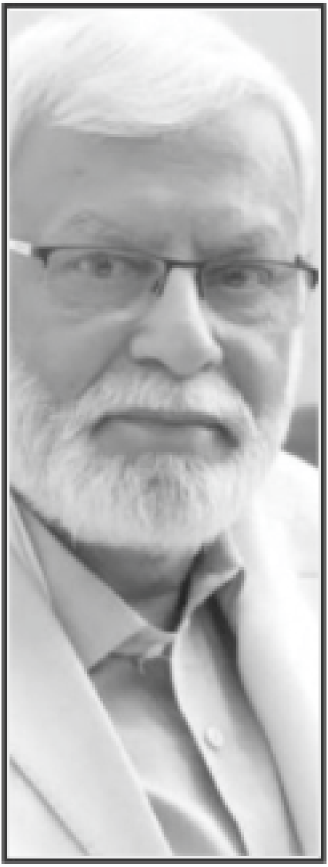

تیری قربت میں رہا میں تو سنور جاؤں گا
دِن بدن دیکھنا مَیں اور نکھر جاؤں گا!

کانچ کا دِل ہے مرا، جسم ہے شیشے کی طرح
اب کے ٹوٹا تو میں رستے میں بکھر جاؤں گا

تُو مجھے دِل میں بسا، سوچ میں شامل کر لے
خواب بن کر تری آنکھوں میں اُتر جاؤں گا

یہ تو در ہے ترا، وابستہ ہے اُمیدِ وفا!
تُو نے بھی چھوڑ دیا تو مَیں کدھر جاؤں گا

مَیں تو زندہ ہوں ترے پیار میں رہ کر نیّر
تُو نے بھی موڑ دیا رُخ تو مَیں مر جاؤں گا

نیّر سرحدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشم تر گیا تھا

غزل

خبر ہے کیا تم کو بہتے پانی! نہیں رہے گی
زمیں پہ آدم کی حکمرانی، نہیں رہے گی

زمین پر رینگتے ہوئے اڑنے لگ گئے تو
جہاں میں خرگوش کی کہانی نہیں رہے گی

پہاڑ پر جب نہ برف پگھلی تو دیکھ لینا
تمھارے دریا کی یہ روانی نہیں رہے گی

سنبھال رکھنا یہ رت جگے اور یہ چاند راتیں
پھر ایک دن آئے گا جوانی نہیں رہے گی

اگر کوئی اور پڑ گیا گور میں تمہاری
تو موت مرجائے گی نشانی نہیں رہے گی

حیات اور موت کا سفر یوں رواں رہے گا
بہار آئی تو رت خزانی نہیں رہے گی

کچھ اور عرصہ سکوں کی نیندیں ملیں تو غافر
ہمارے خوابوں میں سرگرانی نہیں رہے گی

غافر شہزاد

غزل

دیا آندھی میں جلتا جا رہا ہے
اندھیرا ہاتھ ملتا جا رہا ہے

یہ کس منزل کے راہی چل پڑے ہیں
ستارا ساتھ چلتا جا رہا ہے

تمہارے چاند روشن ہو گئے ہیں
مرا سورج جو ڈھلتا جا رہا ہے

چمن کی سیر کو آیا تھا لیکن
وہ کلیوں کو مسلتا جا رہا ہے

مری آنکھیں بھی بوڑھی ہو چلی ہیں
ترا جوبن بھی ڈھلتا جا رہا ہے

ذرا سا آپ کیا بدلے ہیں شاہد
زمانہ ہی بدلتا جا رہا ہے

افتخار شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر مجھ کو چراغوں نے ٹھہرنے نہ دیا
میں وہ لَو تھا جسے سورج نے اُبھرنے نہ دیا

غزل

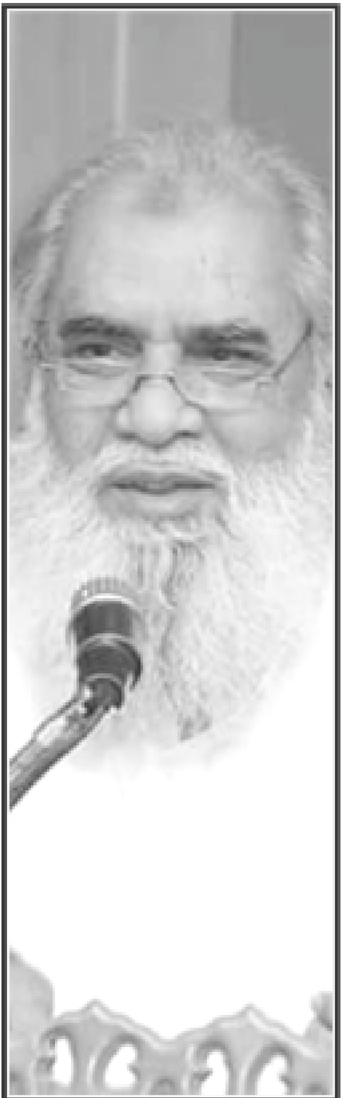

سلوک وہ کیا ہم نے تمہارے خواب کے ساتھ
ملا نہ پائیں گے نظریں کبھی جناب کے ساتھ

ہمیں تھا علم کہ صحرا عبور کرنا ہے
بنا کے رکھی ہے ہم نے، سدا سراب کے ساتھ

اب ان کو سوچنا کیا ان پہ غور کرنا کیا
جو سارے لطف پرانے گئے شباب کے ساتھ

کہا نہیں تھا قدم پھونک پھونک کے رکھنا
کہا نہیں تھا کہ چلنا ذرا حساب کے ساتھ

تمہارے قول کے حق میں دلیل ہو کوئی
کوئی ثبوت سند ہو کوئی جواب کے ساتھ

ہمارے شہر کے آباد تھے کتب خانے
ہماری دوستی ہوتی تھی جب کتاب کے ساتھ

یہ ماہتاب کے چہرے کی چاندنی اکرم
بنا کے رکھنے میں مضمر ہے آفتاب کے ساتھ

اکرم ناصر

غزل

کہتے پھرتے ہیں سبھی حصے میں آیا کم ہے
یار لوگوں نے محبت میں کمایا کم ہے

چاہیے اُس کو کہ وہ کم کا طلبگار رہے
جس نے اِس عشق کے کھاتے میں لگایا کم ہے

ورنہ میں بیٹھ کے معشوق کے شکوے کرتا
شکر یہ تُو نے اِس عاشق کو ستایا کم ہے

میں بہت خوش ہوں کہ بیزار نہیں ہے مجھ سے
یاد رکھا ہے مجھے اُس نے بُھلایا کم ہے

رزق لینے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں
اُس نے تو بخشا مگر ہم نے اُٹھایا کم ہے

سو رہی ہے یہ مری قوم تو شکوہ کیسا
ہم نے خود سونے دیا اِس کو جگایا کم ہے

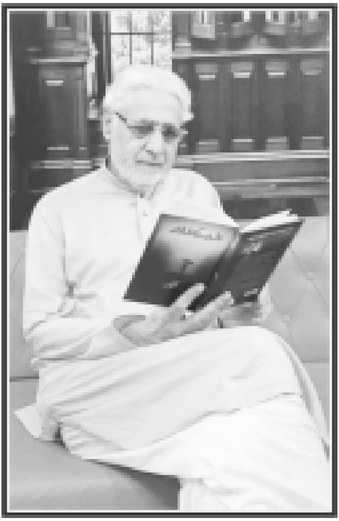

اس لیے چہروں پہ شادابی نظر آتی ہے
ہم نے لوگوں کو ابھی دُکھڑا سنایا کم ہے

نام بھی سُننے کو تیار نہیں ہے لیکن
جانے کیوں لگتا ہے ایسا کہ پرایا کم ہے

دنیا والوں کو قیامت کی گھڑی لگتی ہے
اُس نے چہرے سے ابھی پردہ ہٹایا کم ہے

اقبال سروبہ

غزل

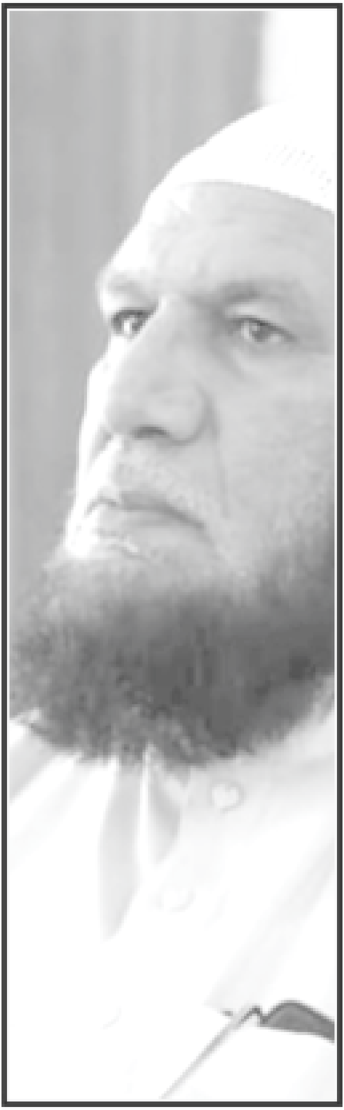

گماں نہیں ہے یقیں ہے ، اشارہ ہوتا تھا
جہاں خلا ہے وہاں بھی ستارہ ہوتا تھا

مکان کچے تھے اور جیب و داماں بھی خالی
مگر فقیروں کا پھر بھی گزارا ہوتا تھا

تمھاری یاد بھلانے گئے تھے گلشن میں
وہاں بھی ذکر ہمارا تمھارا ہوتا تھا

وہ جب بھی آتے تھے مسمار کر کے جاتے تھے
جہانِ خواب جو ہم نے اُسارا ہوتا تھا

بہت سے ڈوب گئے بے دلی میں ورنہ تو
بھنور کی آنکھ کے آگے کنارہ ہوتا تھا

اُسی کے آکے قدم منزلیں بھی چھوتی رہیں
خدا کو جس نے سفر میں پکارا ہوتا تھا

اُسی کو آج بھی بہلا رہے ہیں یاروں میں
وہ چاند چہرہ جو غم کا سہارا ہوتا تھا

زمین زاد رضا کیسے اُس سے مل پاتے
وہ آسمان سے گویا اُتارا ہوتا تھا

رضا اللہ حیدر

غزل

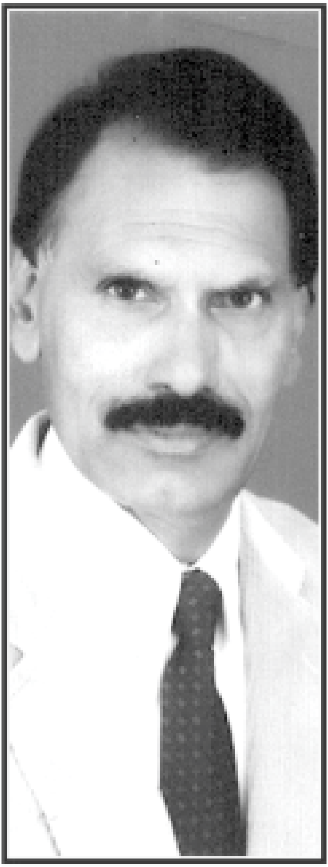

بلندیوں کے سفر پہ نکلو تو پستیاں بھی نظر میں رکھنا
زمیں کے زخموں کے کچھ اثاثے بھی اپنے رختِ سفر میں رکھنا

بھٹک بھٹک کے بھی دشتِ غربت میں منزلوں کی طرف رواں ہوں
میں لوٹ آؤں گا تم جلا کے دیا کوئی رہگزر میں رکھنا

گراں تکلم کے پتھروں سے دلوں کے شیشوں کو بھی بچانا
جو کرچیاں جوڑنے کا فن ہے وہ پھر بھی دستِ ہنر میں رکھنا

ہماری بے پایاں چاہتوں کا نصیب تو نارسائیاں تھیں
نہ جانے کیوں ہم نے پھر بھی چاہا تھا ایک سودا سا سر میں رکھنا

جلیل جیون کی بے رخی سے رفاقتوں کا بھرم نہ ٹوٹے
تمہیں کنارے بھی اب پکاریں تو اپنی نیا بھنور میں رکھنا

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں سرِ کہسار آئے
قد بڑھانے اگر آئے ہیں تو بے کار آئے

غزل

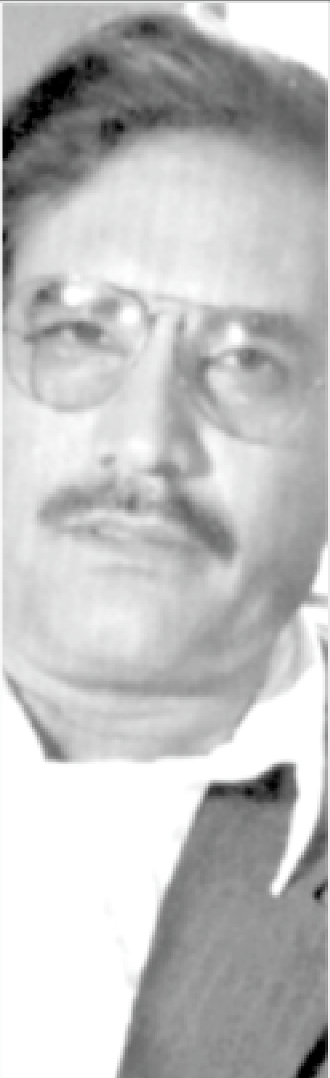

دیارِ دل میں محبتوں کے ہنوز تازہ ہیں، داغ دیکھو
تمہاری یادوں کے ہجر راتوں میں، جلتے بجھتے چراغ دیکھو

اذیتیں اور کیا ملیں گی کہ عشق خود ہے بڑی اذیت
جنوں کی اعلیٰ صفات دیکھو، جنوں کا عالی دماغ دیکھو

یہاں پہ نوحے، یہاں پہ ماتم، یہاں پہ آہ و فغاں کا عالم
یہاں درختوں پہ اُلو دیکھو، یہاں منڈیروں پہ زاغ دیکھو

چہار سُو ہے جو زہرِ نفرت، مزاج برہم، وبالِ فطرت
نظامِ ہستی میں رخنے دیکھو، اُجڑتا دنیا کا باغ دیکھو

ادھیڑتے ہیں تمام بخیے، برائے بخیہ گری، عبث میں
ہماری فرصت کا حال دیکھو، یہ انتہائے فراغ دیکھو

ہوائے آلام یوں چلی ہے کہ چشمِ انسان شبنمی ہے
کہیں سے دورِ طرف کو ڈھونڈو، مسرتوں کا سراغ دیکھو

نہ زرو وزر کی کوئی تمنا، نہ جامِ جم کی طلب ہے شوکت
فقیر کے پاس میلی گدڑی میں، ایک ٹوٹا ایاغ دیکھو

شوکت محمود شوکت

غزل

چراغ تھا جسے خیرات کر دیا میں نے
اندھیری رات کے کاسے کو بھر دیا میں نے

ہنسی مذاق میں موجوں کا خون خشک کیا
پھر اپنی آنکھ سے دریا کو بھر دیا میں نے

پھر ایک روز اسی نے مجھے نکال دیا
وہی تو تھا جسے رہنے کو گھر دیا میں نے

تو، پھر یہ ٹانگوں کی بیساکھیوں کا کیا کرتا
جب اپنا سر ترے شانوں پہ دھر دیا میں نے

بچا ہی کیا تھا مرے پاس ایک دل کے سوا
اٹھا کے وہ بھی ترے نام پر دیا میں نے

جو ساری عمر اسے توڑ توڑ کھاتا رہا
غزل کو ایک نیا مفت بر دیا میں نے

کھڑے ملو گے کہیں منہ چھپانے والوں میں
دکھا یہ آئینہ تم کو اگر دیا میں نے

وہی جو پاؤں سے سر تک مجھے میسر تھا
وہ سب کا سب ہی تمھیں سر بہ سر دیا میں نے

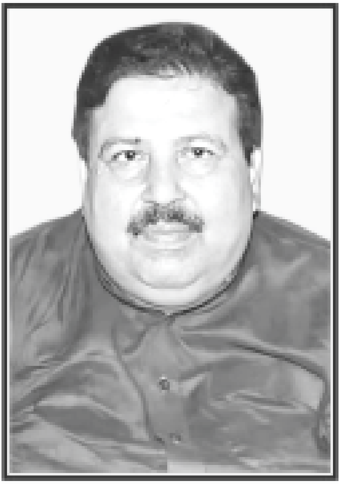

خدا کی راہ میں دیتا تو خیر تھی لیکن
میاں یہ عشق و محبت میں سر دیا میں نے

بنے وسیلہ ہیں بخشش کا جن درختوں کو
شدید گرمی میں پانی سے بھر دیا میں نے

بس ایک شخص کے اندر کا ڈر اتارنے کو
تمام شہر کی آنکھوں کو ڈر دیا میں نے

سوال اس نے بہت کھول کر کیا پھر بھی
اسے جواب بہت مختصر دیا میں نے

مسعود احمد

غزلیں

ابوطالب انیم

جو جنگلوں میں مرے اشک آج اگائیں گے
وہ گیت کل کے پرندے تمہیں سنائیں گے

سنو اے آب نشینو! سنبھال لو مرے لفظ
یہ بیج پانی اترنے پہ کام آئیں گے

میں اپنی قبر میں اتروں گا صورتِ آواز
سو میرے بعد زمانے مجھے بلائیں گے

یہ لوگ روز حقیقت سے ٹوٹتے ہوئے لوگ
یہ میرے خواب مگر دیکھنا بچائیں گے

انیم ہم کششِ ثقل کے حصار میں ہیں
پر ایک روز یہ دیوار ہم گرائیں گے

رائگانی سی رائگانی ہے
برف ہو کر بھی برف پانی ہے

آہ بوڑھی ہیں سب تمنائیں
اور باقی ابھی جوانی ہے

جاں بلب دل میں ایک رستہ تھا
اب تو یہ بات بھی پرانی ہے

آرزو سے بقا ہے سینے کو
اور خود آرزو ہی فانی ہے

یہ جو مایوس ہوں میں ہونے سے
یہ نہ ہونے سے بدگمانی ہے

موت کی بات کیا کریں ہم انیم
زندگی بھی تو ناگہانی ہے

غزل

شور سینے میں کسی شورِ قیامت سے اُٹھا
حشر ایسا دلِ برباد کی وحشت سے اُٹھا

ہنستے گاتے ہوئے اُس بزم میں آیا تھا مگر
دیکھ کر اُن کی طبیعت کو میں حیرت سے اُٹھا

گھڑ لیے لوگوں نے اِس بار فسانے کیا کیا
شور کیا کیا نہ مرے حرفِ ملامت سے اُٹھا

ایک مدّت سے مرا بوریا بستر ہے یہاں
گر اُٹھانا ہے گلی سے تو محبت سے اُٹھا

دیکھ کر ردّ و بدل لہجۂ موجود میں دوست!
اعتماد عہدِ گزشتہ کی حکایت سے اُٹھا

کیسا شکوہ ہے گلہ کیسا، شکایت کیسی
اک اشارے پہ اُٹھا تیری اجازت سے اُٹھا

جس کے انصاف کے چرچے تھے گلی کوچوں میں
ہو کے مایوس بہت اس کی عدالت سے اُٹھا

اب میں ناکام کسی طور نہ لوٹوں گا نبیل
اب جو اُٹھا ہوں تو میں جذبِ شہادت سے اُٹھا

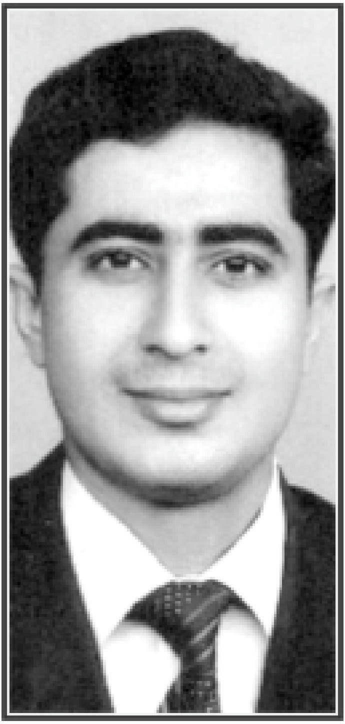

نبیل احمد نبیل

غزل

عجب دیوانگی ہے اس کو اپنا یار لکھتے ہیں
جو اپنا ہے نہیں پھر بھی اسے دلدار لکھتے ہیں

کبھی ڈرتے نہیں حالِ دل و جاں اپنا لکھنے سے
کہ جو بھی سوچتے ہیں وہ سرِ اشعار لکھتے ہیں

کسی کو لے کے لوٹ آئے ہیں اپنے شہر میں لیکن
خطوں میں خود کو وہ اب تک سمندر پار لکھتے ہیں

لکھا کرتے ہیں ان کی یاد میں ہم کچھ نہ کچھ ہر شب
صحافی جس طرح سے صبح کا اخبار لکھتے ہیں

وہ باتیں کیا ہیں جن کو سوچتے رہتے ہیں ہر لمحے
ہیں کیسے دکھ؟ بُھلا کر بھی جنھیں ہر بار لکھتے ہیں

جو دل کے سلسلے ہیں وہ تو دل والے کی جانیں گے
کسک ہو جن کے سینوں میں وہی شہکار لکھتے ہیں

بُرا وہ مانتا ہے سچ کا تو افروز اب ہم بھی
پسِ دیوار رہتے ہیں سرِ دیوار لکھتے ہیں

افروز رضوی

غزل

زمیں خوش تھی فلک مسکا رہا تھا
یہ منظر آنکھوں کو بہکا رہا تھا

برستا ابر دھوکے دینے والا
کہیں چنگاریاں بھڑکا رہا تھا

ہر اک کہتا رہا تھا ہائے یا رب
کسے دنیا سے لے کر جا رہا تھا

قیامت آئی یا ہے آنے والی
یہی اک وسوسہ بھٹکا رہا تھا

سکوں آور دوا بھی کھا کے دیکھی
مگر پھر بھی سکوں کب آ رہا تھا

بنائے گا یہاں اک اور عمارت
پرانے گھر کی اینٹیں ڈھا رہا تھا

یہ اتنے لوگ آئے ہیں کدھر سے
فقط اک شخص بیٹھا گا رہا تھا

وہیں تھا قتل اور غارت گری تھی
ہرا جھنڈا جہاں لہرا رہا تھا

سفینے ڈوبنے پر جاگے ہم لوگ
بہت مدت سے دل سمجھا رہا تھا

رگوں میں دیکھ کر دیمک وہ بولے
کہ تم کو کب سے دکھ یہ کھا رہا تھا

وہ دانش مند پاگل ہے نہیں کیا؟
یہ کیوں پتھر سے سر ٹکرا رہا تھا

رخشندہ نوید

غزل

شگفتہ نعیم ہاشمی

اضطرابِ عشق میں سارا سکوں جاتا رہا
معجزہ یہ بھی ہوا دردِ دروں جاتا رہا

عمر ساری کٹ گئی وارفتگی نہ کم ہوئی
کون کہتا ہے محبت کا جنوں جاتا رہا

دوستوں کی منزلوں کے راستے کچھ اور تھے
اپنا ہر اک راستہ بس آپ سوں جاتا رہا

تھی کبھی دل بستگی دیوانگی کی حد تلک
آپ سے ملنے کا لیکن شوق کیوں جاتا رہا

اجنبی احساس کیسے آ بسا ہے درمیاں
کیا کہوں کیوں وصل کا سارا فسوں جاتا رہا

رابطے کی ہے طلب، نا ربط ہی باقی رہا
ریت جیسے ہاتھ سے وہ دل سے یوں جاتا رہا

رفتہ رفتہ وقت نے پھر زخم سارے بھر دیے
اول اول تھا جو اک حالِ زبوں جاتا رہا

غزل

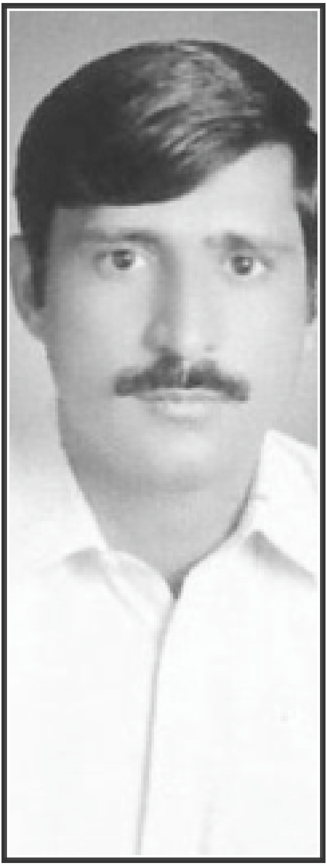

اعجاز دانش

تجھ سے ملنے جو یار آتا ہوں
میں کہاں کوئی پھول لاتا ہوں

میر و غالب سے داد پاتا ہوں
جون کے شعر گنگناتا ہوں

ہوتا ہوتا ہے خود سے ہم آغوش
کب کسی کو گلے لگاتا ہوں

اس کی تصویر سامنے کر کے
میں بھی سورج کو آزماتا ہوں

کوئی ہوتا نہیں ہدف میرا
تیر میں عادتاً چلاتا ہوں

مرغِ بسمل کی طرح میں دانش
دیکھ کر اس کو پھڑپھڑاتا ہوں

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

عرفان حد وہم ، تو ، وجدان حد فہم،
احساس کی حدود سے آگے سنبھل کے آ

غزل

مت ربط بڑھا تو ہر کسی سے
وقت اپنا گزار خامشی سے

بہتر ہے الگ تھلگ رہے وہ
ملتا جو نہیں ہے ہر کسی سے

مطلب کا ہے یار خود غرض ہے
آزردہ ہے جو مری خوشی سے

اُس کو جو اسیر ہے جہاں کا
مطلب نہیں میری دوستی سے

کیا لب پہ نبی کا اسم آیا
دل بھر سا گیا ہے روشنی سے

دنیا کا مزاج آشنا تھا
کل مجھ کو ملا جو بے بسی سے

اک یاد سے منسلک رہی جو
گزرا تھا میں کل اسی گلی سے

ہنستے ہوئے سر پہ چڑھ گیا ہے
جس کو بھی ملے ہیں عاجزی سے

اس کو جو اسیر ہے جہاں کا
مطلب نہیں میری دوستی سے

دنیا سے امام کٹ گیا ہوں
دل بھر سا گیا ہے زندگی سے

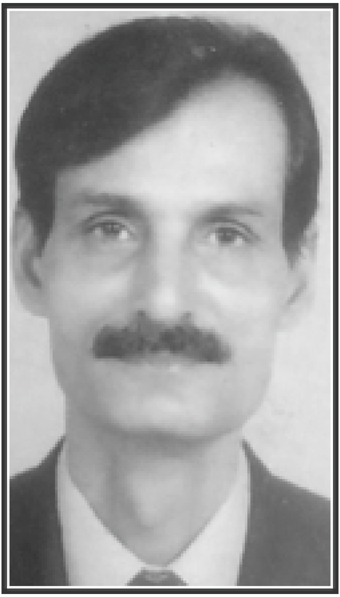

مظہر امام

غزلیں

تم سے کیا میں نے چار باتیں کیں
زندگی نے ہزار باتیں کیں

ہم بچھڑتے ہوئے نہیں روئے
ہم نے زار و قطار باتیں کیں

رات، اختر شماریوں میں کٹی
صبح تک، بے شمار باتیں کیں

میں نے دیکھا تو بند آنکھوں نے
مجھ سے دیوانہ وار باتیں کیں

وقت، آیا مری عیادت کو
موسموں نے بھی چار باتیں کیں

آپ ہی زخم بھی بھرے گا وقت
جس نے یہ تیز دھار باتیں کیں

بادشاہوں سا تھا مزاج اس کا
باادب ہوشیار باتیں کیں

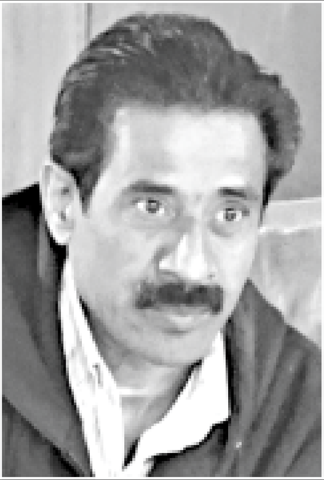

رانا سعید دوشی

میں چکھ رہا ہوں ابھی ذائقہ اجڑنے کا
کہ خوف جھیل چکا ہوں ترے بچھڑنے کا

بُنا گیا تھا بڑے شوق سے کبھی میں بھی
ملال کون کرے اب مرے ادھڑنے کا

خزاں رتوں میں یہ ہوتا تو صبر آ جاتا
عجیب دکھ ہے بہاروں میں پات جھڑنے کا

میں جنگ جیت گیا اس کو درگزر کر کے
زمانہ ڈھونڈ رہا تھا جواز لڑنے کا

میں پیاس اوڑھے ہوئے گر پڑا تھا صحرا میں
ملا پھر اذن مجھے ایڑیاں رگڑنے کا

غزلیں

تنویر قاضی

بن پیراہن آتشدان کے آگے
نارنجی منظر زندان کے آگے

خوف آمیز ہے سطحِ آب کا منظر
مچھلی تیرتی ہے امکان کے آگے

سیس نوا لینا مٹی کے دل پر
مت کرنا منت دربان کے آگے

ہوں رسوا تیری نیلاہٹ نیچے
روز کرایہ دار مکان کے آگے

پنگھٹ پنگھٹ چپ گاگر بھرتی ہے
مونا لیزا تجھ مسکان کے آگے

مژگاں مژگاں دشمن پتھر بھر لو
پھینکنے ہیں دل نے شیطان کے آگے

ہجر سمٹتا وصل امکان کے آگے
بادل ٹکڑے دھوپ زبان کے آگے

گھنگرو گھنگرو دروازہ کھلنے تک
کون سرکتا ہے سامان کے آگے

اک مشکل وقتِ رخصت کی گاڑی
ایک رکاوٹ پائیدان کے آگے

کاجل کاجل پھریں بناتی آنکھیں
اک بستی شہرِ سنسان کے آگے

دن کو کر دے گا کالی شب کاگا
بولتا جاتا ہے مہمان کے آگے

خواب نگر تک جا سکتی ہے کشتی
مانجھی سوچو سرخ نشان کے آگے

غربت اور محبت کی یہ غربت
گل پھینکے کس نے گلدان کے آگے

غزل

تھکن سے چور ہو کر دیکھنا ہے
مجھے گرنے کا منظر دیکھنا ہے

اُڑے جاتے ہیں پتھریلی فضا میں
پرندوں نے سمندر دیکھنا ہے

کہانی کربلا کی لکھ رہا ہوں
عدو مجھ کو بہتر دیکھنا ہے

بہت دشوار رستوں پر کھڑا ہوں
مجھے اپنا مقدر دیکھنا ہے

کہاں تک فاصلے بڑھتے رہیں گے
اسے آخر پلٹ کر دیکھنا ہے

یہ آنسو کس طرف سے آ رہے ہیں
مجھے خود میں اتر کر دیکھنا ہے

کوئی پیغام ہی آئے گا شاید
مجھے چھت پر کبوتر دیکھنا ہے

نکل آیا ہوں کس جانب اکیلا
مجھے شاید کیلنڈر دیکھنا ہے

اسی منظر سے تصویریں بنیں گی
ہمیں اپنا ہی پیکر دیکھنا ہے

محمد نوید مرزا

غزل

ساکت ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے قدم
جلتے ہوئے چراغ ہیں، چلتے ہوئے قدم

رکتے نہیں کبھی بھی کسی کی پکار پر
منزل شناس ہوتے ہیں اٹھے ہوئے قدم

رقصاں ہیں آسماں پہ ستاروں کی ٹولیاں
سنگیت پر قدم سے ملاتے ہوئے قدم

رستے نکل رہے ہیں نئے سے نئے یہاں
کام آ گئے کسی کے اٹھائے ہوئے قدم

اس خوف نے تو چھین لی آنکھوں سے نیند بھی
واپس نہ کھینچ لے وہ بڑھائے ہوئے قدم

اڑنے کا شوق رکھتا ہے اونچی ہواؤں میں
چلتا ہے جو زمیں سے لگائے ہوئے قدم

نکلا ہے کون، کون طلب کے حصار سے
روشن ہیں آنکھ، آنکھ میں پھیلے ہوئے قدم

ہوں گے نہ دستیاب کبھی رہگزار کو
دل کے معاملات میں الجھے ہوئے قدم

گلشن میں شاخ، شاخ سے کلیوں کا جھانکنا
جیسے کہ ہوں بہار کے سہمے ہوئے قدم

روکے گا بھی سنبھال بھی لے گا یقیں کا ہاتھ
نیت کے ڈگمگاتے، بھٹکتے ہوئے قدم

وہ کامیاب ہوں گے زمانے میں ایک روز
آکاش جو اٹھائیں گے سوچے ہوئے قدم

احمد سبحانی آکاش

غزل

پیار کی خوشبو مرے دل کے نگر میں رہ گئی
شکر ہے جبراںؔ گھر کی بات گھر میں رہ گئی

میں نے جب چاہا اسے لفظوں میں پورا لکھ سکوں
اک کمی سی دوستو عرضِ ہنر میں رہ گئی

رات بھر کمرے میں تنہائی بھٹکتی ہی رہی
ایک آہٹ تھی کہ جو دیوار و در میں رہ گئی

جتنے صدمے تھے وہ سب ماضی کا قصہ ہو گئے
ایک تازہ چوٹ تھی جو اس خبر میں رہ گئی

چہچہاتے سب پرندے جب سے ہجرت کر گئے
بس خموشی ہی یہاں سوکھے شجر میں رہ گئی

نقش سارے مٹ گئے جبراںؔ لیکن آج بھی
ایک صورت سی مرے قلب و نظر میں رہ گئی

بجھ گئیں آنکھوں کی شمعیں یاد میں جلتے ہوئے
روشنی پھر بھی کسی زخمِ جگر میں رہ گئی

جانے کتنی بار شکوے آئے تھے لب پر مگر
ہر شکایت ڈوب کر اک چشمِ تر میں رہ گئی

چلتے چلتے وہ نجانے کس جگہ پر رک گیا
اور اُس کے ہاتھ کی خوشبو سفر میں رہ گئی

وسیم جبران

غزل

اے مری یاد میں بسے لوگو
جانے کب آؤ گے بھلے لوگو

ایک تتلی کے پر مسلتے ہو
پھول چنتے ہوئے ارے لوگو

میری آنکھوں کو غور سے دیکھو
میرے چہرے کو دیکھتے لوگو

دن میں سونے سے احتراز کرو
خواب راتوں کو ڈھونڈتے لوگو

اپنی مٹی تمہیں بلاتی ہے
اجنبی دیس بس گئے لوگو

گرم راتوں میں سو نہ پاؤ گے
سرد موسم میں کانپتے لوگو

اٹھ کھڑے ہوں کہ امن قائم ہو
ظلم کے پاؤں میں پڑے لوگو

کھوٹے سکوں کا راج ہے اصغر
تم کہاں رہ گئے کھرے لوگو

کتنے چھوٹے ہو اپنے کاموں میں
اپنے ہی آپ میں بڑے لوگو

تم نہیں جانتے سمندر کو
دشتِ امکان میں گھرے لوگو

اصغر علی بلوچ

غزل

رہنے ہی دیتا نہیں فرعون جب رستا کوئی
غرق کرکے اُس کو رکھ دیتا ہے پھر موسیٰ کوئی

نصرتِ حق، غیب سے آئے مدد کو کس طرح
کام تو ہم میں نظر آتا نہیں اچھا کوئی

حق نے چاہا تو نکل آئے گی صورت خیر کی
مت کرے مایوس ہو کر ایسے واویلا کوئی

جب بھی پھنس جاتی ہے اُمت گردشِ حالات میں
چارہ کرتے ہیں مکینِ گنبدِ خضریٰ، کوئی

امن کی دیوار میں جب جنگ کا کھل جائے دَر
کام پھر آتا نہیں تعویذ اور نسخہ کوئی

کرتی ہے اک فاختہ سب دعویداروں سے سوال
ظالموں کا ہاتھ بھی ہے روکنے والا کوئی؟

عالمِ اسلام کی شیرازہ بندی کے لئے
یاالٰہی، بھیج اپنا نیک دِل بندہ کوئی

ہونے لگتا ہے جونہی فیضانؔ دُنیا میں سکون
اُٹھ کھڑا ہوتا ہے پھر نمرود کا بچہ کوئی

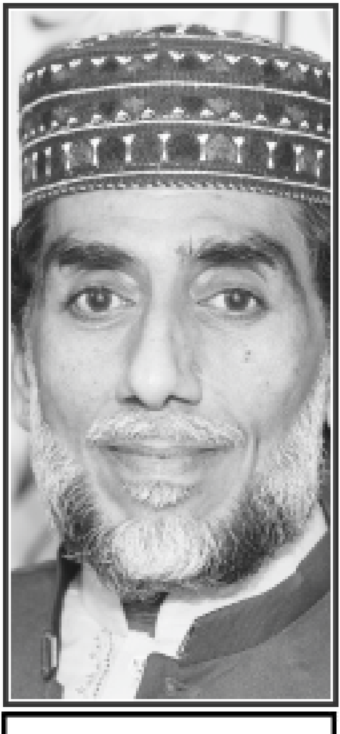

فیض رسول فیضان

غزل

کھو گئے رنگوں کے جگنو اب کہاں
خوشنما شاموں کے پہلو اب کہاں

تھم گیا ہے وقت غم کے دشت میں
بھاگتے لمحوں کے آہو اب کہاں

رک گیا ہے سر پہ آ کر آفتاب
ریشمی سائے کے گیسو اب کہاں

جھڑ گئے پلکوں سے اشکوں کے گلاب
درد کے موسم کی خوشبو اب کہاں

گر گئے ہیں برگ شاخوں سے تمام
پیڑ کی پلکوں پہ آنسو اب کہاں

بِک گیا ہے دشمنوں کے ہاتھ وہ
کٹ چکا جو میرا بازواب کہاں

تجھ سے مل کر تو مجھے بھی یوں لگا
تیرے جیسا ہے کوئی تُو اب کہاں

اعجاز روشن

غزل

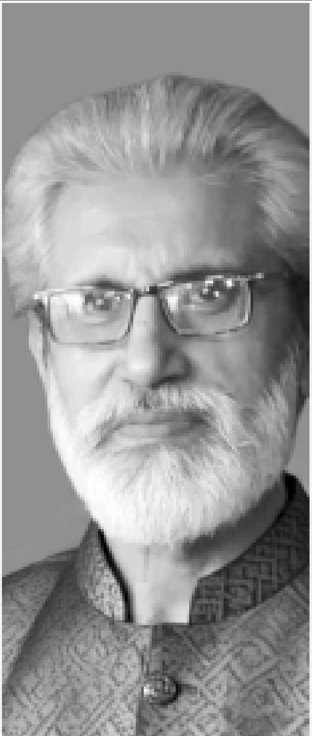

افضل ہزاروی

مجھے آئینہ وہ دکھانے لگا تھا
مگر عیب اپنے چھپانے لگا تھا

جسے بھائی سمجھا تھا میں نے ہمیشہ
وہ دیوار گھر میں اٹھانے لگا تھا

کہ جس عمر میں تھی پڑھائی ضروری
میں اس عمر میں ہی کمانے لگا تھا

بھروسے کی دیوار گرنے لگی تھی
بہت جب سے قسمیں وہ کھانے لگا تھا

کہ رسوائی افضل کی ہونا تھی لازم
بہت اس گلی آنے جانے لگا تھا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آفاقِ ماہ تاب کہاں ، کنجِ در کہاں
نِکلتا ہے آسماں کا دیا طاق پر کہاں

غزل

عابد خان عابد

آدمی دیوتا نہیں ہوتا
پھر بھی اتنا برا نہیں ہوتا

ذات کے آئینے میں جھانک ذرا
کوئی بھی بے خطا نہیں ہوتا

وقت کا قافلہ بدلتا ہے
ورنہ رستہ نیا نہیں ہوتا

ہر کوئی اپنی ذات میں تنہا
قید ایسا رہا نہیں ہوتا

موت وعدہ نبھاتی ہے آخر
تیرا وعدہ وفا نہیں ہوتا

جس کو دیتا ہے حرف شعر بقا
مر بھی جائے فنا نہیں ہوتا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزل

پھینکنا پانی میں کنکر دائروں کو دیکھنا
دائروں کو دیکھنا پھر فاصلوں کو دیکھنا

مشغلہ دلچسپ ہے تنہائی میں گھر بیٹھ کر
کھولنا نقشے پہاڑی سلسلوں کو دیکھنا

کیا تمنا ہمسفر کی آرزو منزل کی کیا
خالی راہوں پر ٹہلنا راستوں کو دیکھنا

شام ڈھلتے گھیر لیتی ہے عجب سی کشمکش
کھیلنا شطرنج خود سے زاویوں کو دیکھنا

زندگی میں رہ گئی ہے بس یہی مصروفیت
دیر تک ٹیلی وژن پر تبصروں کو دیکھنا

کیا قیامت کی اذیت ہے اُداسی میں امر
دوستوں کے طنزیہ سے قہقہوں کو دیکھنا

امر مہکی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر اُس کی کھڑکی روشن کیوں رہتی تھی
کچھ نہ کہا ہم نے بھی ، جان لیا البتہ

غزل

بڑا تھا شوق اس دل کو محبت آزمانے کا
دگرگوں ہے مگر سارا نظام اس کارخانے کا

جو باتیں ہم پہ ہوتی ہیں انہیں دل پر نہ رکھا کر
تو میرے ساتھ ہے تو پھر مجھے کیا ڈر زمانے کا

جو پھولوں سے مہکتا ہے گلستاں تیرے آنگن کا
تو موسم آ گیا ہے اب مرے گھر کو سجانے کا

ہوا کے ساتھ کیا اڑنا، پرندو پر سمیٹو تم
یہ آندھی تھم نہیں سکتی پتہ کر لو ٹھکانے کا

زمانے بھر کے غم سہہ کر یہ جینا بھی ہے کیا جینا
صلہ پایا تو کیا پایا تیری دنیا میں آنے کا

عون الحسن غازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نماز مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثناگر وضو کریں

غزل

ابتدا ظلم و ستم کی ، انتہا کے بعد بھی
کربلا کا سامنا ہے کربلا کے بعد بھی

سرفروشوں نے دکھایا ہے زمانے کو میاں
قوم لڑتی ہے عدو سے رہنما کے بعد بھی

تا ابد تازہ رہے گی یاد اصغر کی یہاں
حُرملہ آتے رہیں گے حُرملہ کے بعد بھی

تم کبھی جا کر یہ پوچھو اُس یزیدِ وقت سے
کاتبِ تقدیر کوئی ہے خدا کے بعد بھی

سر کٹا کر بھی زمانے میں ہوئے ہم سرخرو
تجھ کو حاصل کیا ہوا ظالم جفا کے بعد بھی

ہاتھ اُٹھتے دیکھتا ہوں آسمانوں کی طرف
درد جب گھٹتا نہیں دل کا، دوا کے بعد بھی

آندھیوں کا اس طرح بھی ٹوٹ جاتا ہے غرور
ٹمٹماتے ہیں دیے ارشد ہوا کے بعد بھی

ارشد محمود ارشد

غزل

دور سے ہر شخص ہی لگتا تھا دریا کی طرح
گویا اپنی زندگی تھی ایک صحرا کی طرح

ایک چہرہ تھا جسے ہم کاٹتے تھے رات دن
چاند پر بیٹھی ہوئی لاچار بڑھیا کی طرح

دھوپ اتنی تھی کہ لگتا تھا یہاں ہر آدمی
موم کی پگھلی ہوئی بے شکل گڑیا کی طرح

خوب صورت جسم بھی گویا قفس سونے کے تھے
اور ان جسموں میں دل اپنے تھے چڑیا کی طرح

پیروی کرتے ہوئے فرعون کی ڈوبے تھے ہم
مار ڈالے تھے کہ جو تھے لوگ موسیٰ کی طرح

لے کے آ پہنچا وہاں ہم کو فریبِ آگہی
کھائی دکھتی تھی جہاں اوجِ ثریا کی طرح

مجھ کو دنیا سے کوئی شکوہ نہیں تھا، ہاں مگر
ان سے شکوہ تھا کہ جو لگتے تھے دنیا کی طرح

جان دے دوں گا میں اس دنیا کی خاطر ایک دن
اور وہ مجھ کو بھلا دے گی ہمیشہ کی طرح؟

میں کوئی یوسف نہیں تھا پر تمنا تھی مری
کاش کوئی چاہتا مجھ کو زلیخا کی طرح

رات گاتا تھا کوئی اک گیت مجھ میں ہجر کا
اور لے تھی گیت کی آوازِ گریہ کی طرح

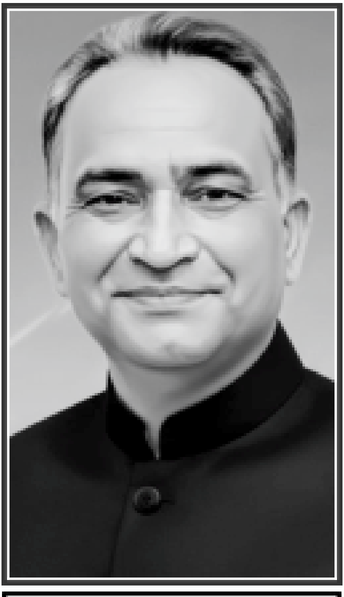

علمدار حسین

غزل

نواح دل کی دھمالوں کا ذکر کرتا ہوں
میں ہر غزل میں غزالوں کا ذکر کرتا ہوں

جو روشنی کے مخالف ہیں چھپتے پھرتے ہیں
میں ایسے ڈھب سے اجالوں کا ذکر کرتا ہوں

یہ میں بدل گیا ہوں یا بدل گئے منظر
جو چند لمحوں میں سالوں کا ذکر کرتا ہوں

اسی لیے تو یہ دریا مرا مخالف ہے
میں روز ڈوبنے والوں کا ذکر کرتا ہوں

کہیں جو بنتی نہیں بات قہقہوں سے مری
دلا وہاں ترے نالوں کا ذکر کرتا ہوں

اسی سے تم مری مجبوریاں سمجھ جاؤ
یہ میں جو گزرے حوالوں کا ذکر کرتا ہے

تم اس کو شعر سمجھتے ہو، داد دیتے ہو
میں جذب دل سے خیالوں کا ذکر کرتا ہوں

وہ بات کرتا ہے شمشیر جب اشاروں میں
تو میں بھی صرف مثالوں کا ذکر کرتا ہوں

شمشیر حیدر

غزل

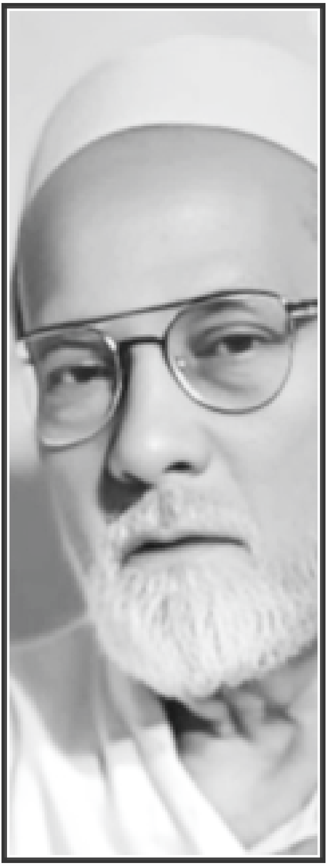

اشرف یعقوبی

ورق ہوا سے کہانی کا گر پلٹ جائے
تو تیری یاد کا بادل بھی سر سے چھٹ جائے

یہ بات کیسے میں آوارگی کو سمجھاؤں
بچی ہوئی ہے جوانی وہ گھر میں کٹ جائے

ذرا سمیٹ لوں خود کو سنبھال لوں پہلے
عجب نہیں ہے کہ دنیا مری سمٹ جائے

اگر زمانہ خفا ہے تو میں منا لوں گا
اگر وہ دنیا ہے تو راستے سے ہٹ جائے

ابھی جوں بیچ سکو تم تو بیچ لو خود کو
وہ دن نہ آئے کہ قیمت تمہاری گھٹ جائے

انتخاب

خالد احمد

لے جائیں گی کہاں مجھے تنہائیاں مری
وسعت پذیر ہیں ابھی پہنائیاں مری

نعمان منظور

غزل

میتھیو محسن

اپنے خود میں ہے جو سحر روشن
ہو گا اس سے نگر نگر روشن

اُس نے جب پیار سے پکارا ہے
پھر ہوا ہے مرا سفر روشن

جانے کب ساتھ چھوڑ جائیں چراغ
رکھنا اپنے دل و نظر روشن

سوختہ جاں ہیں عشق سے پوچھو
حسن والوں کے کیوں ہیں گھر روشن

دل مرا کب کا بُجھ گیا ہوتا
گر نہ رکھتی تری نظر روشن

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

غزل

نوید عاجز

ہنر ٹھکانے لگا؛ شعر سب قبول ہوئے
خیال کھل کے مرے جب کلی سے پھول ہوئے

پڑے ہیں خاک میں لتھڑے تمام خواب مرے
کسی حسین کے ماضی کی کوئی بھول ہوئے

مٹائے روح کے سب داغ غم کی بارش نے
تو غم تمھارے مری جاں کہاں فضول ہوئے

اساسِ متن سے ہم کو نکال پھینکا گیا
ہم اک حوالہ تھے جو، حاشیوں کی دھول ہوئے

پرایا بوجھ اٹھاتا نہ میں تو کیا کرتا
کسی کے خواب مری آنکھ پر نزول ہوئے

اصول بیچ کے دستار باندھنے والے
تمھارے جیسے بھلا کیسے با اصول ہوئے

جب اک ضرورت اُسے میرے در پہ لے آئی
ہوس یہ کہنے لگی، پیسے سب وصول ہوئے

نوید جس کی وفاؤں پہ ناز تھا ہم کو
جب اس نے زخم دیے تو بہت ملول ہوئے

غزل

عشق میں جیت کو امکان میں رکھ کر دیکھا
یوں قدم اک نئے میدان میں رکھ کر دیکھا

تتلیاں بھی نہیں آتی ہیں اسیروں کی طرف
ہم نے گل دان کو دالان میں رکھ کر دیکھا

بیچتا ہوں تو خریدار نہیں ملتا کوئی
بارہا خود کو بھی سامان میں رکھ کر دیکھا

جب بھی پایا ہے اسے بھاری ہی پایا ہے سدا
ہم نے اس وقت کو میزان میں رکھ کر دیکھا

پاس رہ کر نظر آتا نہیں تھا لیکن
پھر کئی روز اسے دھیان میں رکھ کر دیکھا

سیکھنا گر نہ ہو فطرت میں تو حاصل نہیں کچھ
کوئلہ ہیرے کی سو کان میں رکھ کر دیکھا

یہ گرانی میں فقط آپ ہی اپنی ہے مثال
ہم نے اس دکھ کو جو طوفان میں رکھ کر دیکھا

محمد ظہیر قندیل

غزل

وہ مسکراتا ہوا ہر کسی سے ملتا تھا
وہ جس سے ملتا تھا زندہ دلی سے ملتا تھا

کوئی بھی بھول نہ پایا ہے اُس کے لہجے کو
عزیز سب سے ہی شائستگی سے ملتا تھا

کسی کا دل نہ دُکھایا کسی بھی موقع پر
ہر اک بشر سے سلامت روی سے ملتا تھا

ہمیشہ ہم نے تو دیکھا ہرا بھرا اُس کو
عزیزِ جان تھا اور زندگی سے ملتا تھا

نظر وہ چاند سے جب بھی ملایا کرتا تھا
تو روشنی کا نشاں روشنی سے ملتا تھا

وہ آدمی سے محبت کا درس دیتا تھا
عمل یہ اُس کا سدا بندگی سے ملتا تھا

تھے اُس کے دوست فقط چند لوگ دنیا میں
وہ آدمی تھا فقط آدمی سے ملتا تھا

کسی بھی شخص کو کم تر نہ جانتا تھا عزیز
ہر ایک شخص سے وہ ہم سری سے ملتا تھا

وہ قیس کے ہی قبیلے کا فرد تھا اے ندیم
ثبوت اِس کا نری عاشقی سے ملتا تھا

ریاض ندیم نیازی

غزل

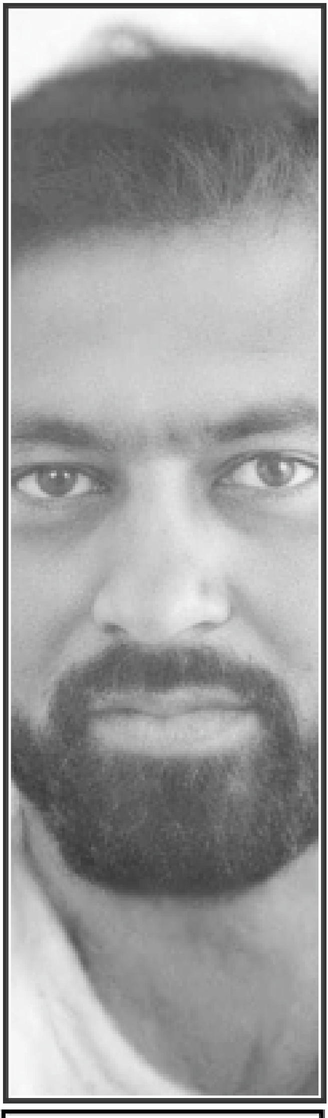

ہواؤں کے حوالے ہو گئے ہیں
وفا کے رنگ پھیکے ہو گئے ہیں

وہ جو تازہ کیے رکھتے تھے ہم کو
وہ سب قصے پرانے ہو گئے ہیں

ہوا ایسی چلی ہے کچھ دنوں سے
کہ ہم جیسے تھے ویسے ہو گئے ہیں

کہانی بن گئی چھوٹی سی اک بات
ذرا سے زخم گہرے ہو گئے ہیں

نظر آتی ہے جو حالت ، نہیں ہے
ترے ملنے سے اچھے ہو گئے ہیں

مکمل ہو گئی ہے اب کہانی
ترے ہوتے ادھورے ہو گئے ہیں

یہ کس کی زلف برہم یاد آئی
بہت روشن دریچے ہو گئے ہیں

کبھی مرنا نہیں اب ہم کو عاصم
ہمیں ایسے اشارے ہو گئے ہیں

عاصم اعجاز

غزل

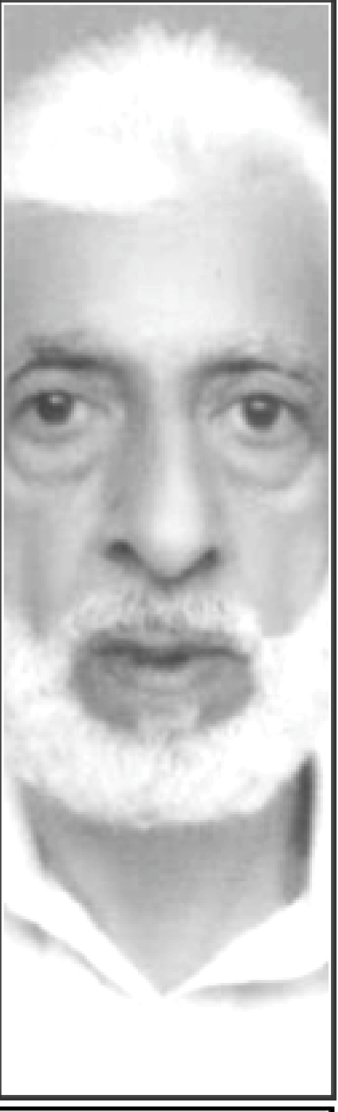

عشق کرنا تو انتہا کرنا
ورنہ شاہد خدا خدا کرنا

حسرتیں جب جوان ہو جائیں
پھر مرے دوست حوصلہ کرنا

کاش اے کاش جانتا میں بھی
سنگ ریزوں کو آئنہ کرنا

اتنا آسان تو نہیں صاحب
بے وفاؤں کو باوفا کرنا

منزلِ شوق مل ہی جائے گی
تم مسافت کی ابتدا کرنا

دفن ہو جائے ساتھ میرے جو
اِس طرح کے ہنر کا کیا کرنا

دل میں جن کا قیام ہو شاہد
اُن کے جانے کا کیا گلہ کرنا

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

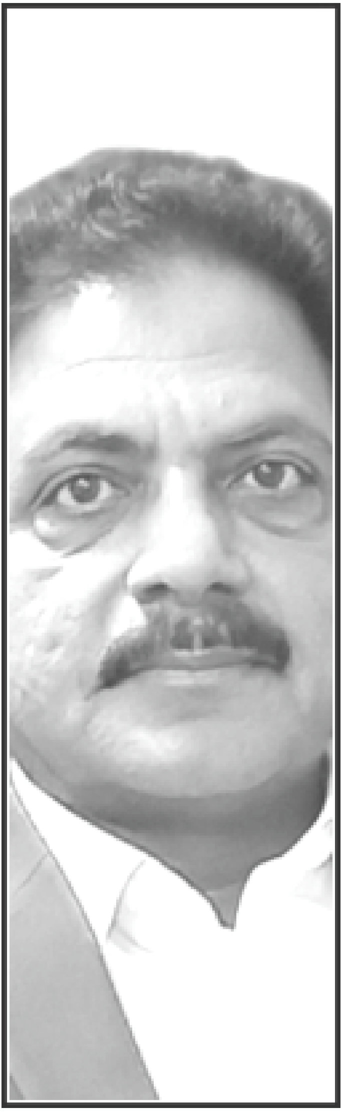

دلشاد احمد

میں جو کچھ خوابوں کے زریاب لیے پھرتا ہوں
زندہ رہنے کے یہ اسباب لئے پھرتا ہوں

یہ جو دو چار ہیں دو چار ہی مل پائے ہیں
دوست ہمراہ میں کم یاب لئے پھرتا یوں

میری پیشانی پہ اک شورِ ریا ہے برپا
زعمِ عبدیت و محراب لیے پھرتا ہوں

کون پوچھے گا زر و مال کے اس جھنجھٹ میں
یہ جو گلیوں میں ترے خواب لئے پھرتا ہوں

میں وفاؤں کے اجالوں کو سرِ شہرِ جفا
کو بہ کو صورتِ مہتاب لیے پھرتا ہوں

تیری دانست میں دو آب کے قطرے ہونگے
یہ جو آنکھوں کو گہر یاب لیے پھرتا ہوں

جانِ دلشاد کبھی آ کہ سرِ خانۂ دل
ریشم و اطلس و کمخواب لیے پھرتا ہوں

غزل

اب نیا اور نہ مجھ سے کوئی وعدہ کیجیے
وہی پیمان جو باندھے گئے ایفا کیجیے

شبنمی ہاتھ سے کچھ معجزہ ایسا کیجیے
ایک قطرہ ہوں مجھے لمس سے دریا کیجیے

آپ کے بعد مرا وقت کٹے گا کیسے
مجھ کو اس شہر میں اتنا بھی نہ تنہا کیجیے

ان کہی بات کا جو لطف ہے رہنے دیجیے
یعنی اظہار میں آنکھوں کو وسیلہ کیجیے

دل کی جانب نہ اچھالیں یہ گماں کے کنکر
بے خیالی میں نہ اس جھیل کو گدلا کیجیے

کوئی تاوان جو مانگا تو یہ مر جائے گی
بس محبت میں محبت کا تقاضا کیجیے

بھیڑ یہ خانۂ دل میں نہیں اچھی لگتی
یہ مکاں جس کا نہیں ہے، اسے چلتا کیجیے

ڈال دیتے ہیں مرے پاؤں میں زنجیر سی آپ
وقتِ رخصت نہ کبھی شوق سے دیکھا کیجیے

آپ کے واسطے دامن میں کوئی پھول تو ہو
صرف ایسے میں بہاروں کی تمنا کیجیے

اکرم جاذب

غزل

مقدور ہوں گر باغِ تخیل میں بلاوے
اک شوخ پری زاد ہمیں عشق سکھاوے

اس شہر میں عاشق ہوا ہر شخص اُسی پر
جو ڈومنی میلے میں کھڑی ڈھول بجاوے

صرّاف کے بقچوں میں نہاں لعل و زمرد
بازار میں چالاک حسینوں کے دکھاوے

ایسا بھی ہے جاں سوز کوئی اہلِ جنوں میں
جو چائے کی فنجان میں طوفان اٹھاوے

اک نہر امیدوں کی رواں ہے پسِ خاشاک
اور دشت میں ٹیلوں سے پرے سرخ کجاوے

ٹوٹی ہوئی اک باؤلی برسوں سے ہے ویران
جنات موکل ہیں پری زاد چھلاوے

اس بار مرادوں کے لیے نذر کروں کیا
درگاہ پہ مصنوعی ذہانت کے چڑھاوے؟

خوابیدہ ہوا خاکِ شبستانِ اجل پر
اس نیند سے اب صورِ قیامت ہی جگاوے

بستی میں پھریں شام سے گم گشتہ مسافر
ہے کوئی جو سیل فون پہ آواز لگاوے

کس طور مشیں زادے کا دل ٹوٹا ہے افسوس
نے خاک اڑاوے ہے نہ وہ اشک بہاوے

سالار، جری، میرِ سپہ، طالعِ بیدار
میدان میں جو فتح کی روداد سناوے

عابد رضا

غزلیں

دیوارِ دل سے لپٹی ہوئی یاد اور ہے
در سے جُڑے فسانوں کی تعداد اور ہے

بے خوابیوں کو غور سے دیکھا تو یہ کھلا
خوابوں میں ایک رنگ ترے بعد اور ہے

چاہوں تو مصلحت کو فریضہ قرار دوں
پر کیا کروں کہ سنّتِ اجداد اور ہے

ویرانیاں ہیں میرے مضافات میں مگر
دنیا کوئی وجود میں آباد اور ہے

آئینۂ خیال کے عکسوں نے کہہ دیا
ہم سے ورا سپاہِ عدم زاد اور ہے

دریا کے بیچ بھول رہا ہوں شناوری
ساحل پہ کیا خبر کوئی افتاد اور ہے

تبدیل اس قدر ہی سزا ہو سکی مری
اس بار میرے واسطے جلّاد اور ہے

افتخار الحق

شب گئی بنیاد کی تعمیر میں
دن کئی لگ جائیں گے تعبیر میں

جا بجا ملتا ہے رسم الخط نیا
لوحِ قسمت پر لکھی تحریر میں

مسئلہ اور حل گلے ملتے مگر
ٹھن گئی تقدیر اور تدبیر میں

کھل کے برسے کس طرح ابرِ بدن
آفتاب وقت کی زنجیر میں

لفظ کا جب تک نہ سرمایہ لگے
ہے خسارہ درد کی تشہیر میں

کھل اٹھا گُل کی طرح کوئی قلم
بھر گئی خوشبو کسی تحریر میں

بے خودی جب خوش نگاہی سے ملی
آئنہ آیا نظر تصویر میں

کچھ تو مشکل پیروی تھی قیس کی
کچھ کمی تھی دشت کی تاثیر میں

متن کے پردوں میں جو مستور تھی
بات کھل کر آ گئی تفسیر میں

غزل

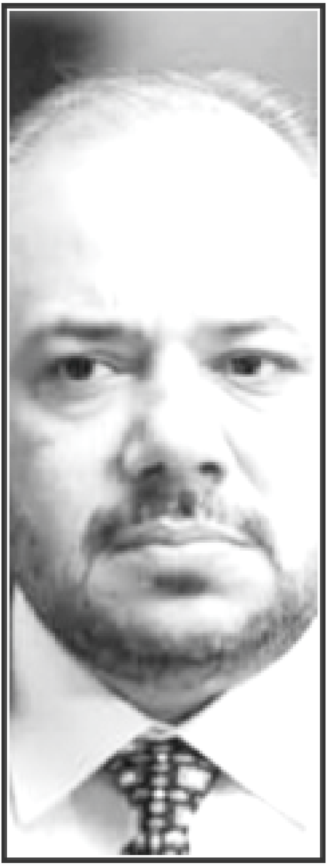

بزم آخر ہمیں سجانی پڑی
شام غم ہم کو بھی منانی پڑی

اب مروت میں کیا بتاؤں تمھیں
مختصر دوستی نبھانی پڑی

جن سے پردہ نہ کوئی حرمت تھی
پوری دیوار ہی ہٹانی پڑی

روز و شب حرف جو سکھاتا تھا
اس کی تحریر بھی مٹانی پڑی

جو تصور سے بھی نہیں نکلا
اس کی تصویر تک ہٹانی پڑی

اس نے ایسا دغا دیا آصف
یہ کہانی مجھے سنانی پڑی

آصف خیال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رُتوں کے قافلے چلتے رہیں گے
دکھ اپنے وقت پر پھَلتے رہیں گے

غزلیں

وہ کنارے سے مجھے دیکھ رہا ہنستے ہوئے
یعنی اب ڈوبنا بنتا ہے مرا ہنستے ہوئے

جانے والوں کی کمی اپنی جگہ لیکن ہم
زندگی تجھ کو گزاریں گے سدا ہنستے ہوئے

ہونے لگتی ہے کبھی دھوپ میں بارش جیسے
ایسے اک شخص بھی تھا رونے لگا ہنستے ہوئے

لوگ پھر تکنے لگے رشک بھری نظروں سے
اُس نے محفل میں مرا نام لیا ہنستے ہوئے

ہجر والوں کو ملے مجھ سے ہنر جینے کا
اے مصور مری تصویر بنا ہنستے ہوئے

پہلے وہ ہاتھ چھڑا کر مرے پہلو سے اٹھا
دیکھ کر اشک مرے بیٹھ گیا ہنستے ہوئے

اس کو کہتے ہیں مقدر کا سکندر ہونا
میرا دشمن بھی مجھے آج ملا ہنستے ہوئے

آ گیا مجھ کو دسمبر میں پسینہ اکمل
اس نے جب لہجہ کیا سخت ذرا ہنستے ہوئے

اکمل حنیف

کرتے نہیں ہیں جب کوئی نقصان پرندے
پھر مارتے ہیں کیوں بھلا انسان پرندے

میں تم کو نگہبانِ چمن مان لوں کیسے
ہر پیڑ پہ بیٹھے ہیں پریشان پرندے

ہر ایک سہولت ہے تری قید میں ان کو
حالت سے مگر لگتے ہیں بے جان پرندے

کرتے نہیں ہیں کل کے لیے رزق ذخیرہ
مضبوط بڑا رکھتے ہیں ایمان، پرندے

بے خوف انہیں دیکھ کے میں سوچ رہا ہوں
صیاد سے شاید ہیں یہ انجان پرندے

موسم کے بدلتے ہی چلے جائیں گے واپس
کچھ دن کے لیے آئے ہیں مہمان پرندے

اکمل کسی کو رزق کی ہو گی نہ کوئی فکر
بن جائیں اگر شہر کے سلطان پرندے

غزل

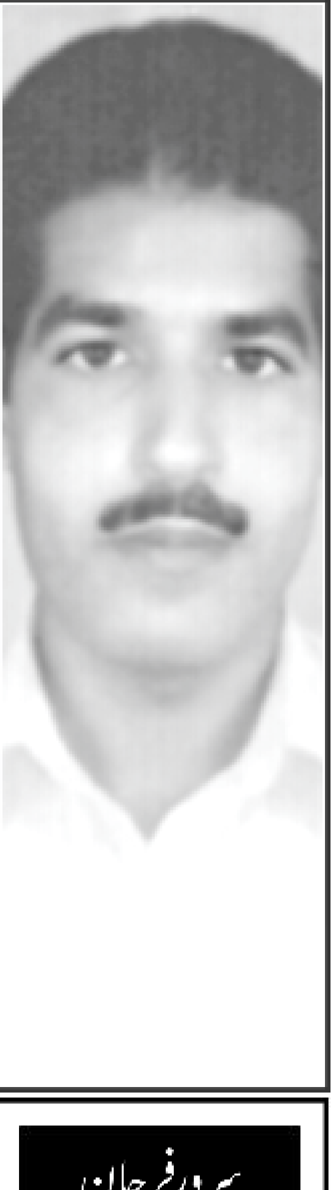

سرور فرحان

ترے رخ پر تری زلفوں کو برہم دیکھنا چاہوں
میں اپنی ذات کے اندر کا موسم دیکھنا چاہوں

سجا کر میں تجھے محرابِ جاں کے آبگینوں میں
نگاہِ شوقِ بے پایاں سے ہر دم دیکھنا چاہوں

اداسی کے مناظر مجھ سے تو دیکھے نہیں جاتے
تبسم تیرے ہونٹوں پہ میں ہر دم دیکھنا چاہوں

تو میرے واسطے اے دیدۂ گریاں نہ گریہ کر
کسی کے واسطے تجھ کو میں پُرنم دیکھنا چاہوں

جہاں ہوں بس تری یکتائی کے نغمے زبانوں پر
میں اپنے آس پاس اک ایسا عالم دیکھنا چاہوں

ترے پیکر کو چھو کر بھی نہ گزرے رنج و غم کوئی
تری جانب رواں خوشیوں کو پیہم دیکھنا چاہوں

ہیں کیا کیا نقش تحریروں کی صورت میں رقم فرحان
سبھی گزرے ہوئے سالوں کا البم دیکھنا چاہوں

غزل

جانے کیسی یہ بیقراری ہے
اک اداسی فضا پہ طاری ہے

بات کرتا تو ہے محبت سے
لہجہ اس کا وفا سے عاری ہے

کون جاتا ہے اپنی مرضی سے
فیصلہ کب یہ اختیاری ہے

اب نہیں کھلتی اسکی خاموشی
اس کی چپ میں بھی وضعداری ہے

بات کرنا ہوا ہے کیوں مشکل
دل کی حالت بھی اضطراری ہے

فیصلے سب کے سب اسی کے تھے
زندگی گو کہ یہ ہماری ہے

ساتھ چلنا ہوا تھا مشکل اب
غلطی اس میں کب تمہاری ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

ہجر نے ہم کو لازوال کیا
نفع دیتے ہیں کچھ خسارے بھی

غزل

کام آئی نہ کچھ بھی یہاں گویائی ہماری
چپ ہو گئے تو جگ کو سمجھ آئی ہماری

ہر لحظہ سنورنے لگے انداز نظر کے
جب سے ہوئی اُس شہ سے شناسائی ہماری

سب رنگ ترے چہرے کے رنگوں سے ملے ہیں
تجھ گل کے توسط سے ہے رعنائی ہماری

کچھ عشق کی ترکیب میں وحشت بھی ہے شامل
اور اُس پہ طبیعت بھی ہے صحرائی ہماری

کیوں بار لگے ہم کو گراں باریٔ دل بھی
جب درد کی جاگیر ہے آبائی ہماری

ہو جائے ثمر بار کبھی اپنی ریاضت
آجائے ترے کام مسیحائی ہماری

تخلیق میں خالق کی جھلک دکھتی ہے سب کو
اُس حسن کے صدقے سے ہے زیبائی ہماری

اک عمر ہوئی سنگ تراشی ہمیں کرتے
پوروں میں اتر آئی ہے بینائی ہماری

محفل میں بھرم سارا ہے اس ضبط کے دم سے
رہ جائے گا کیا آنکھ جو بھر آئی ہماری

پاتال زدہ ذہن کہاں بات کو پہنچیں
اونچی ہے نگہ، سوچ ہے بالائی ہماری

کوثر کے کنارے پہ ملیں گے سرِ محشر
صد شکر کہ نسبت جو ہے زہرائی ہماری

احمد نواز

غزل

ایک ہی وقت میں دو بار نہیں ہو سکتا
کون کہتا ہے کہ یوں پیار نہیں ہو سکتا

حسن بھی سامنے ہو عقل کے بھی تابع ہو
آدمی اتنا سمجھ دار نہیں ہو سکتا

میں نے پھر کس لیے دینی ہے صفائی اپنی
تو اگر میرا طرف دار نہیں ہو سکتا

کھیل یہ سارا اگر علت و معلول کا ہے
آدمی کچھ بھی ہو بے کار نہیں ہو سکتا

چاہے دو گز ہی سہی نام رہے گی میرے
کس نے بولا میں زمیں دار نہیں ہو سکتا

فن سے بھی رشتہ ہو اور بغض بھی ہو لوگوں سے
وہ قمر کچھ ہو کلاکار نہیں ہو سکتا

قمر بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرم نوا رہتے ہیں

غزل

محمد اشفاق بیگ

بلا کی زد میں ہوں اب تک نظر اتار کے بھی
بہت اداس ہوں میں خال و خط سنوار کے بھی

نہیں ہے ہمدم و غم خوار شہر بھر میں کوئی
میں اجنبی ہوں یہاں عمر اک گزار کے بھی

خزاں کے ساتھ ہے لازم بے رنگ و بو موسم
بے کیف دن ہیں کیوں اب کے برس بہار کے بھی

تمام رات سفر میں رہا میں خوابوں میں
میں مضمحل ہوں ابھی تک تھکن اتار کے بھی

وہ مجھ سے جیت کر اشفاق کیوں ہے افسردہ
یقیں کرو میں بہت خوش ہوں اس سے ہار کے بھی

انتخاب

– خالد احمد –

اندھیر رہ نہیں سکتا سدا خدائی میں
خدا گواہ بنے گا مری صفائی میں

نعمان منظور

غزل

خالق آرزو

دریچے کھلے ہیں ہوائیں نہیں ہیں
تھی امید جن کی فضائیں نہیں ہیں

وفا کا سبق جا بجا ہم نے سیکھا
جو دیکھا جہاں میں وفائیں نہیں ہیں

برسنے کے آثار بھی دیکھتا ہوں
فقط تیرے غم کی گھٹائیں نہیں ہیں

محبت کرو تو محبت ملے گی
مگر الفتوں کی صدائیں نہیں ہیں

اٹھو گے تو قسمت بنے گی تمہاری
سڑک سامنے ہے سرائیں نہیں ہیں

جیو جینے دو آرزو ہے ہماری
کرو نیکیاں یہ بلائیں نہیں ہیں

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

---------انتخاب---------

- خالد احمد -

------نعمان منظور------

غزل

شکوہ بے گھری تمام کرے
آئے دل میں ابھی قیام کرے

آنے والے ہیں دن مصیبت کے
رزق گریہ کا اہتمام کرے

آنکھیں ٹکرا رہی ہیں آنکھوں سے
اب تو بولے وہ کچھ کلام کرے

پہلے آنکھوں کا دبدبہ دیکھے
اور پھر تیغ بے نیام کرے

بادشاہت سے کب کسے فرصت
حکمرانی کوئی غلام کرے

بے یقینی سی خود پہ ہونے لگے
کوئی ایسے نہ احترام کرے

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے
لب رسیلے نہ رہے، نین نشیلے نہ رہے

غزل

یہ لوگ بھی کس عہد کے کردار ہوئے ہیں
ہر چہرے پہ تہذیب کے آثار ہوئے ہیں

ہر سمت دھواں پھیل گیا شہرِ ہنر میں
یہ کس لیے الفاظ شرر بار ہوئے ہیں

جو لوگ کبھی سایۂ دیوار میں گم تھے
وہ کیسے تری بزم کا معیار ہوئے ہیں

احساس کے دریا میں اترنے کی سزا ہے
کچھ لوگ یہاں زیست سے بیزار ہوئے ہیں

ہم نے تو سدا سچ کی ہی تعبیر لکھی تھی
پھر کیوں مرے اشعار ہی تلوار ہوئے ہیں

ہر دیدۂ نوخیز میں یہ خوف ہے کیسا
کچھ خواب نئے نیند سے بیدار ہوئے ہیں

جو درد ہیں سینے میں، قرینہ ہے سخن کا
ہر سمت مرے نام کے اخبار ہوئے ہیں

صحرا بھی مرے ساتھ ہی چلتا رہا برسوں
کچھ زخم مرے وقت سے ہموار ہوئے ہیں

ہر شخص یہاں قید ہے خود خول میں اپنے
رشتے بھی عجب ڈھب سے گرفتار ہوئے ہیں

میں نے تو ولی دل کی فقط بات کہی تھی
کیوں لوگ مرے درپے آزار ہوئے ہیں

شاہ روم خان ولی

غزل

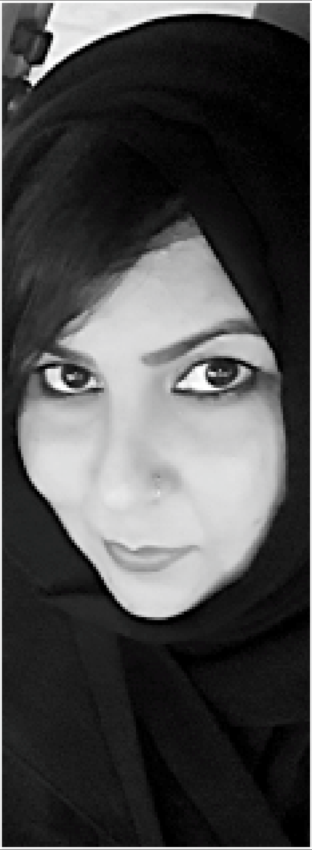

نہیں ہے خوش اضطراب میں ہے
مرا یہ دل بھی سراب میں ہے

میں کیسی راہوں میں کھو گئی ہوں
سبھی قصور انتخاب میں ہے

وہ یوں تو لگتا ہے سب کے جیسا
مگر جدا کچھ جناب میں ہے

میں چاہے اس میں نہیں ہوں شامل
مگر وہ دل کے نصاب میں ہے

میں اس کی آنکھوں میں ایسے ڈوبی
کہ ڈوبا کوئی چناب میں ہے

یہ مجھ کو محسوس ہو رہا ہے
کہ پھر سے کوئی عتاب میں ہے

فرح شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سورج اُبھرے تو زمیں پر سے اُٹھائے سائے
روشنی آئے مگر ساتھ نہ لائے سائے

غزل

ہماری اپنی زندگی ہمارے ہاتھ میں نہیں
پھر اس کے بعد موت بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں

یہ بات میں مٹھاس بھی کسی کی خاص دین ہے
زبان کی یہ چاشنی ہمارے ہاتھ میں نہیں

یہ دھڑکنوں کی تال بھی رواں کسی کے دم سے ہے
ہماری ایک سانس بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں

خیال کو سنوارنا نکھارنا تو ہے بجا
مگر نزولِ شاعری ہمارے ہاتھ میں نہیں

دکھائی دے رہا ہے سب کسی کی آب وتاب سے
نگاہ کی یہ روشنی ہمارے ہاتھ میں نہیں

یہ سوز کی لطافتیں گداز کی یہ نکہتیں
یہ چاشنی، یہ نغمگی ہمارے ہاتھ میں نہیں

ہمارے ہاتھ میں نہ تھا ''الست'' کا جواب تک
ہمارا تو سوال ہی ہمارے ہاتھ میں نہیں

حضور اس کا آنا اُس کی مرضی پہ ہے منحصر
خیال کی یہ جل پری ہمارے ہاتھ میں نہیں

سرور حسین نقشبندی

غزل

تری بے رخی کا گلہ نہیں کہ وہ میرا وقتِ زوال تھا
جسے تو نے ہنس کے اڑا دیا مری زندگی کا سوال تھا

ترا تذکرہ جو ہوا کبھی تو بکھر گئے مرے سارے رنگ
جو نہ مٹ سکا میری روح سے مری جان تیرا ملال تھا

یہ طلسمِ چشمِ نمک زدہ، کہ فریبِ گردشِ وقت ہے
جسے دیکھتی تھی میں چار سو، کوئی خواب تھا نہ خیال تھا

مرا عکس تھا ترے نور سے، میں تو چاندنی کی مثال تھی
مری روشنی کے جمال میں، تری نسبتوں کا کمال تھا

اسے مل گئے نئے ہم سفر، میں پرانی دھول میں کھو گئی
کہیں زندگی تھی سکون میں کہیں سانس لینا محال تھا

مرے عزمِ نو کی یہ جیت ہے، کہ فضا بھی نغمہ سرا ہوئی
وہاں خواب میں نے سجا لیے جہاں دیکھنا بھی محال تھا

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چڑیاں اڑ اڑ کر رہ جائیں
بابل کا گھر بھول نہ پائیں

غزل

نعمان محمود

جانا جدھر تھا منع، اُدھر تو نہیں گیا
پھر بھی میں اپنے ضبط سے مر تو نہیں گیا

خاموشی دھار لیتے ہیں ملتے ہی مجھ سے آپ
مجھ سے دل آپ کا کہیں بھر تو نہیں گیا

آنکھوں میں رنگ ہے نہ لبوں پر کوئی ترنگ
صاحب ! خمارِ عشق اُتر تو نہیں گیا

کل تک جو کہہ رہا تھا کہ بس آپ کا ہوں میں
اپنے بیان سے وہ مُکر تو نہیں گیا

اب سُوئے میکدہ نہیں نعمان کا گزر
پوچھو کہ نامراد سُدھر تو نہیں گیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کو چُھو کر ماہتابی ہو گیا
جھیل کا پانی شہابی ہو گیا

غزل

عروج پر تھا جو اسے زوال کیسے ہو گیا؟
یہ مجھ سے اک عجیب سا سوال کیسے ہو گیا؟

جنابِ شیخ مخمصے میں ہیں کہ ایک رند کا
خدا کے ساتھ رابطہ بحال کیسے ہو گیا؟

ہمارے ساتھ یہ ہُوا کہ مبتلائے عشق تھے
مگر بتائیں آپ کا یہ حال کیسے ہو گیا؟

میں پائمال ہوگیا ہوں خود ہی اس کے سامنے
سو پائمال ہو کے پائمال کیسے ہو گیا؟

زہے نصیب آپ کو ہماری یاد آ گئی؟
زہے نصیب آج یہ کمال کیسے ہو گیا

مثال دے رہے ہیں لوگ کس لیے صغیرؔ کی
وہ ایک عام شخص بے مثال کیسے ہو گیا؟

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دور کچھ بھی نہیں، اے جاں، تری دارائی سے
کبھی دزدانہ گزر جا، مری تنہائی سے

غزل

یہ اِختیار کے لمحے، یہ اِقتدار کے دن
نہیں رہیں گے میاں! یہ سدا بہار کے دن

بُنے گا دیکھنا کیسے خدا برنگِ عدل
تری گرفت کا بانا، مری پکار کے دن

کب آئے گا کوئی ایسا جو حق ہو سر تا پا
کب آئیں گے یہاں حاکم پہ اعتبار کے دن

تمام ہوگئیں سانسیں ہماری صبر کے ساتھ
ہُوئے نہ ختم ہمارے یہ اِنتظار کے دن

تمھیں بھی یاد تو ہوں گے وہ سرخوشی کے گلاب
تمھارے قرب کی راتیں، مرے حِصار کے دن

گیا تو تھا میں کسی کام سے کہیں نازش!
اور آگیا ہُوں نہ جانے کہاں گزار کے دن

شبیر نازش

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اُڑتی تتلی میں ڈھل جائیں
رنگ کِسی کے ہاتھ نہ آئیں

غزل

بخت ویران، قلب پارا ہے
زندگی تلخیوں کا دریا ہے

دشتِ امید میں بھٹکتی ہوں!
ہر طرف وحشتیں ہیں، صحرا ہے

جس کو غیروں سے خوف آتا تھا!
اس کو اپنوں نے مار ڈالا ہے

جو سمجھ میں کبھی نہیں آیا
زندگی! بس وہی معمّا ہے

ہجر کی سرخ وادیوں سے پرے!
اک جہانِ حسین بستا ہے

خواب گاہوں میں دل اُبلتے ہیں
بستروں پر بھی خوف آتا ہے

آہ بھرتے ہوئے میں سوچتی ہوں!
کس ستم گر سے دل لگایا ہے؟

خاک دانوں سے خاک ملتی ہے!
عشق، اہلِ جنوں کا خاصا ہے

کوئی مسکان گل کسی کا نہیں!
ہم نے لوگوں کو آزمایا ہے

مسکان گل

غزل

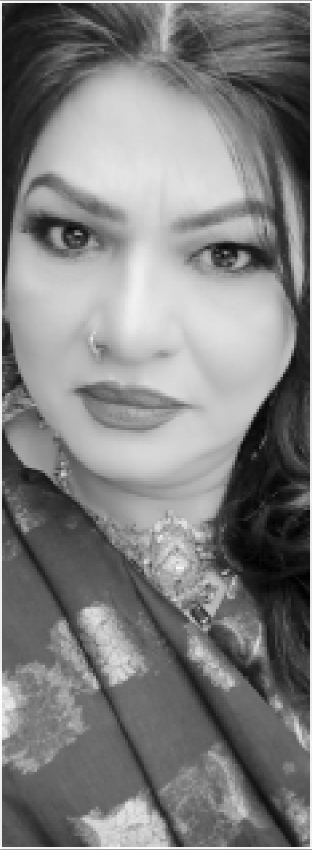

اس لیے بھی تو روا رکھتی ہوں غفلت تم سے
باتوں باتوں میں نہ ہو جائے محبت تم سے

میں سرِ بام زمانے کو بتاؤں کیسے
عید مشروط ہوئی چاند کی صورت تم سے

دیکھنا کوئی ملاوٹ نہیں ہونے دینی
مانگ سکتی ہوں کسی روز امانت تم سے

کیا خبر تھی کہ یہیں عمر بسر کرنی ہے
لینے آئی تھی مرے یار! اجازت تم سے

میرا ہر حرف مہکتا ہے تری یادوں سے
میرے اشعار مرے نام کی شہرت تم سے

سامنے آؤ تو پھر کیسے بتاؤں گی جیا
میرے کمرے میں اترتی ہے صباحت تم سے

جیا قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تمام دن وہی راہیں سفر پہ اُکسائیں
سفر کی رات جو پاؤں پکڑنے لگتی ہیں

غزلیں

متاعِ گمشدہ تیرے لیے بے کار رہتے ہیں
نشیمن میں گزشتہ خواب کے آثار رہتے ہیں

کئی ہیں الجھنیں ایسی سرا جن کا نہیں ملتا
انہیں سلجھا رہے ہیں ہم تبھی بیدار رہتے ہیں

مری مٹھی میں جگنو اور ستارے قید ہیں کب سے
انہیں آزاد کرنا ہے یہاں بیمار رہتے ہیں

کسی بھی قول کی خاطر لٹاتے جان ہیں اپنی
ہم ایسے لوگ ہیں جو برسرِ پیکار رہتے ہیں

جو نسلی پیڑ ہوتے ہیں وہ آخر تک نہیں مرتے
انہیں تم کاٹ بھی ڈالو وہ سایہ دار رہتے ہیں

مری قسمت اگر تم روبرو اک دن مرے آؤ
کئی اظہار رہتے ہیں کئی انکار رہتے ہیں

راشدہ کنول

کچھ ہاتھ مجھے زخم لگانے میں لگے ہیں
کچھ زلفِ پریشاں کو سجانے میں لگے ہیں

ہمدرد نہیں ان کو منافق ہی کہیں گے
خود آگ لگا کر جو بجھانے میں لگے ہیں

بیٹوں کو محبت کے لیے وقت کہاں ہے
دن رات مشقت سے کمانے میں لگے ہیں

کچھ ابرِ کرم ہم پہ کرو رحمتِ عالم
ہم لوگ گلستاں کو بچانے میں لگے ہیں

جو لوگ سناتے ہیں مجھے خوابِ گریزاں
وہ سوزِ دروں میرا جگانے میں لگے ہیں

رضوانہ مسرت

غزل

نشاں ملے ہیں جو ظلمت میں راہ بر کے مجھے
دکھا رہے ہیں وہی راستے سحَر کے مجھے

بھٹک رہا ہوں ابھی ذات کے بیاباں میں
ملیں گے دیکھنا! آثار مُستقر کے مجھے

حریمِ شوق میں ان کو سجائے پھرتا ہوں
بڑے عزیز ہیں تحفے، ستم نگر کے مجھے

کبھی بھی دشتِ بلا میں رکوں تو سوچتا ہوں
ہے کون؟ جس نے دِیے، حوصلے سفر کے مجھے

جہاں ہمالہ صفت عزم، ہوتا ہے ریزہ
صدائیں دیتے ہیں وہ راستے سفر کے مجھے

مَیں جن کو گھاس کا اِک ڈھیر ہی سمجھتا رہا
بچا رہے ہیں وہی گھونسلے شجر کے مجھے

خدا کے واسطے کچھ تو مرا خیال کرو
کہ مار ڈالیں گے یہ زاویے نظر کے مجھے

بچا کھچا ہے جو دِل میں قرار، کھو ہی نہ دُوں
نظر نہ آیا کرو اس طرح سنور کے مجھے

اگر نہیں، تو پتا اپنے گھر کا یاد نہیں
وگرنہ یاد ہیں پتے، نگر نگر کے مجھے

کچھ ایسے زخم لگے ہیں رہِ محبت میں
کہ راہ گیر ہیں تکتے ٹھہر ٹھہر کے مجھے

جگر جلا کے مَیں جمشید، صُبح کرتا ہوں
سلام کرتے ہیں شمس و قمر، اُتر کے مجھے!

جمشید کمبوہ

غزل

عاصم بخاری

ہر سُو تاریکیاں ہیں جالے ہیں
دُور اس شہر سے ، اجالے ہیں

گورے اجسام ہیں لیے پھرتے
کس قدر من کے لوگ کالے ہیں

ذکر بات حق کوئی بھی نہیں کرتا
یہ زبانوں پہ کیسے تالے ہیں

غزہ ہو ، قدس ہو ، کہ ایراں ہو
سب کے سب ظلم کے حوالے ہیں

بارہا ہم نے یہ ، کیا ثابت
بے وفائی نبھانے والے ہیں

کتنے چالاک ہیں یہ سادہ سے
آستینوں میں سانپ ، پالے ہیں

چوٹ جو بھی لگی ہمیں عاصم
درد اشعار میں ، ہی ڈھالے ہیں

غزل

سینہ ہے داغ داغ تیرے بعد
مضطرب ہے دماغ تیرے بعد

رنگ ، خوشبو ، شگفتگی ہے کہاں
کب رہا باغ ، باغ تیرے بعد

اجڑا اجڑا سا ہے دیارِ سخن
محفلیں بے چراغ تیرے بعد

ساز چپ ہیں ، اداس میخانہ
واژگوں ہیں ایاغ تیرے بعد

اب اندھیروں میں کون لائے گا
روشنی کا سراغ تیرے بعد

تیرے نقشِ قدم سے روشن ہیں
راستوں میں چراغ تیرے بعد

گونجتے ہیں تمہارے نغموں سے
وادی و باغ و راغ تیرے بعد

تجھ کو اللہ نے کر دیا رخصت
ہم کو کب ہے فراغ تیرے بعد

مرتضیٰ سیّد

غزل

کالی رات کا جاڑا ہے اور بیچ سڑک میں چلتا ہوں
جانوروں کی آوازوں میں لگتا نہیں کہ تنہا ہوں

پاؤں کی چاپ سنائی دے تو دل مٹھی میں ہوتا ہے
میرے ہاتھ پہ میرا لہو ہے اپنے خون کا پیاسا ہوں

باگھ کے جنگل والی بستی میں اک لڑکی آس سے ہے
زخمی جسم کے ساتھ میں بھوکا پیاسا دن بھر چلتا ہوں

جانے کیسا وقت تھا جب میں آٹھ بجے سو جاتا تھا
صبح کی سرخی پھیل رہی ہے اور میں کروٹیں لیتا ہوں

میں کہتا تھا: بستی چھوڑنے والے پاگل ہوتے ہیں
شہر کو جانے والی گاڑی کے اب پیچھے لٹکا ہوں

ایک طرف تری دنیا ہے اور ایک طرف مری دنیا ہے
ایک کو دن بھر جھیلتا ہوں اور ایک سے رات کو ملتا ہوں

امتیاز انجم

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

کس کو معلوم کہ کس دم کوئی پل آ پہنچے
کون سے موڑ پہ کس چاپ کی مہکار آئے

غزل

چل رہا ہوں شکستہ پا اے دوست !
عشق ہے میرا رہنما اے دوست !

کس لیے اب اداس بیٹھے ہو ؟
ہجر کا چُن کے راستا اے دوست!

یہ غمِ روزگار کا احسان !!
جو تجھے خوش نہ رکھ سکا اے دوست!

قافلہ بھی اُسی نے لُوٹ لیا
شہر میں جو تھا رہنما اے دوست !

میں سمجھتا رہا وفا جس کو
اصل میں وہ فریب تھا اے دوست!

ظلم کے سامنے جھکے گا نہیں
جس کے اندر ہے کربلا اے دوست!

جس گھڑی تم نے ہاتھ چھوڑا تھا
دل پہ گزرا تھا زلزلہ اے دوست!

گھر میں جب سے دیا جلایا ہے
ہے مخالف مری ہوا اے دوست !

اک ترے ساتھ پہ بھروسا تھا
اور تُو ہی بچھڑ گیا اے دوست !

پھر نہ پچھتائے تُو گنوا کے مجھے
عشق میں اور نہ آزما اے دوست !

پھر مجھے مات ہو گئی مہدؔی
یار جب غیر سے ملا اے دوست !

غضنفر مہدی

غزل

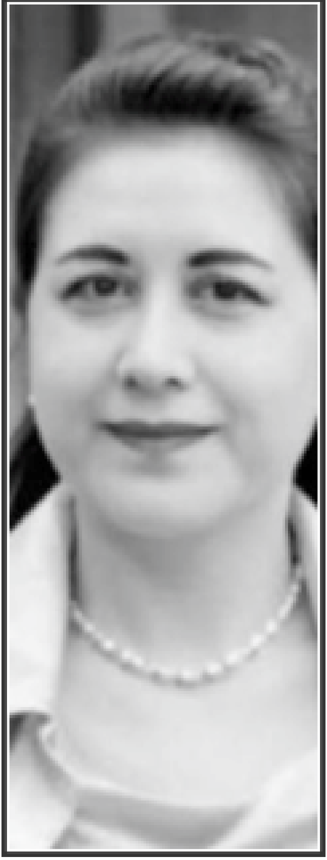

کوکی گل

تتلی اداس، بھنورہ جواں، اب نہیں رہا
گلشن میں پہلے جیسا سماں، اب نہیں رہا

پروانے جاں لٹاتے تھے، جس پر تمام شب
وہ بجھ چکی ہے شمع، دھواں اب نہیں رہا

رہتا تھا تیری یاد میں، آنکھوں سے جو رواں
نا جانے کیوں وہ دریا رواں، اب نہیں رہا

ہے سلسلہ ازل سے یہی، اس جہان کا
تھا کل یہاں جو، آج یہاں اب نہیں رہا

رہتی تھی جسکی کھوج میں، تو، کوکی گل! کبھی
شاید وہ اس گلی میں مکاں، اب نہیں رہا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

غزل

کچھ مجھ پہ رحم کھا کہ مجھے چپ سی لگ گئی
دل! وحشتیں گھٹا کہ مجھے چپ سی لگ گئی

کوئی تو روک لیتا جدائی سے پیشتر
خاموش وہ رہا کہ مجھے چپ سی لگ گئی؟

ورنہ تو اختلاف کو کیا کیا نہ تھی دلیل
بس احترام تھا کہ مجھے چپ سی لگ گئی

ظاہر میں قہقہوں سے بہت رابطے رہے
باطن میں وہ ہوا کہ مجھے چپ سی لگ گئی

میں رفتگاں کے پاؤں میں منت کی بیڑیاں
کس طرح ڈالتا کہ مجھے چپ سی لگ گئی

تھا لمحۂ وصال کہ فرقت، میں خوش رہا
میں نے یہ کب کہا کہ مجھے چپ سی لگ گئی

تیری سماعتوں کی ہے گویائی منتظر
تُو جلد لوٹ آ کہ مجھے چپ سی لگ گئی

ثمر جمال

اقبال کا تصورِ قومیت اور پاکستان

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی خود نوشت ''گریباں چاک'' میں اقبال کے نام ایک خط کی صورت میں چند استفسارات کیے ہیں۔ ان میں سے ایک سوال کا مفہوم یہ ہے کہ آپ نے وطنی قومیت کی نفی کی تھی پھر مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کیوں کیا؟ میں نے جب ایک ملاقات میں ان سے پوچھا کہ آپ نے جتنے سوالات اٹھائے ہیں ان کے جوابات تو آپ اقبال پر اپنی مختلف تحریروں میں پہلے سے ہی دے چکے ہیں پھر اس کا کیا جواز ہے تو انھوں نے بڑے معنی خیز توقف کے بعد جواب دیا کہ یہ تو بس ایک استفہامیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔

اس جملۂ معترضہ سے ہٹ کے اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ جہاں تک قومیت کے عام اور مروج تصور کا تعلق ہے اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ

''یہ ایک خاص نوعیت کا احساسِ اتحاد ہے جو کسی جمعیت کو باقی نوعِ انسانی سے ممیز کر دیتا ہے۔''

گل کرائسٹ کہتا ہے کہ

''جذبۂ قومیت ایک روحانی احساس یا اصول ہے جو لوگوں کے ایسے گروہوں میں پیدا ہوتا ہے۔

جو عام طور پر ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہوں، ایک علاقے میں آباد ہوں، ایک ہی زبان بولتے ہوں، ایک ہی مذہب سے کے ماننے والے ہوں، ان کی تاریخ اور روایات میں اشتراک ہو، ان کے مفادات اور سیاسی روابط مشترک ہوں اور سیاست کے لیے یکساں مقاصد ان کے پیشِ نظر ہوں۔''

مگر اقبال کا تصورِ قومیت اور تصورِ قومی ریاست پہلے سے موجود ان دونوں کتابی

جلیل عالی

تصورات سے ذرا الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ اور یہ اس کی اخلاقی و روحانی شخصیت کی آدرش پسندی اور برِصغیر میں موجود ہند مسلم تاریخی کشمکش کی پیداوار ہیں۔ اس کشمکش کا آغاز اکبر کے دینِ الٰہی کے خلاف مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی کی فکری مزاحمت سے ہو گیا تھا۔ اس تحریک کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلم جمعیت اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے اور کسی صورت بھی اپنا تہذیبی و معاشرتی وجود کسی دوسری تہذیبی جمعیت میں ضم نہیں کر سکتی۔ برِصغیر کے مسلمانوں کو اپنے تہذیبی وجود کی بقا کے چیلنج کا دوبارہ اس وقت سامنا کرنا پڑا جب یہاں کے تاریخی حالات ایک بہت بڑی کروٹ لے چکے تھے۔ صدیوں سے چلا آ رہا بادشاہی نظامِ سلطنت قصۂ پارینہ بن چکا تھا اور ایک نو آبادیاتی عبوری عہد کے بعد اب فیصلہ سازی کی قوت عددی اکثریت کے ہاتھوں میں جانے والی تھی۔ اسی چیلنج اور ہندو مسلم نزاع کی روز بروز بڑھتی ہوئی شدت کا حل تلاش کرنے کی فکری کوشش اقبال کو اسلام کے آفاقی نصب العین اور ملتِ اسلامیہ کے عمرانی انفرادو اختصاص کی آگاہی تک لے آئی اور اس پر منکشف ہوا کہ ملتِ اسلامیہ کو مغربی اقوام کی طرح کی قوم خیال کرنا درست نہیں ہے کیونکہ:

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

....

یورپ میں دورانِ تعلیم اقبال مغربی اقوام کی قوم پرستی سے پیدا ہونے والے عالمی خلفشار سے پہلے ہی آگاہ ہو چکا تھا۔ اس مشاہدے اور آگاہی نے بھی اقبال کو ایک نئے تصورِ قومیت کی تشکیل کی ضرورت کا احساس دلایا۔ چنانچہ عالمی خلفشار اور برِصغیر کی مقامی ہندو مسلم کشمکش کو سامنے رکھتے ہوئے اقبال نے ایک برتر سطح پر تصورِ قومیت کی تشکیلِ نو کا کارنامہ سرانجام دیا۔ ورنہ مروجہ تصورِ قومیت کے زیرِ اثر ایک طرف آل انڈیا کانگرس مسلمانوں سے منسوب اردو زبان کا استحصال کرنے اور پورے ہندوستان پر ہندی کو بطور قومی زبان مسلط کرنے کی کوشش کر رہی تھی تو دوسری طرف سرسید بھی ویسے ہی ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ہندوستان میں جب تک ایک قوم دوسری پر پوری طرح غالب نہیں آ جائے گی امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ یہ سہرا تو اقبال کے سر جاتا ہے کہ اس نے اپنے عظیم

آفاقی ویژن کی بنا پر برصغیر میں دو قومی نظریے کے خدوخال اجاگر کیے اور یہ موقف اختیار کیا کہ چونکہ یہاں دو ایسی بڑی قومیں آباد ہیں جن کا نظریہ حیات، زبان، کلچر، تاریخ اور ادب و فنون، سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ دونوں کو اپنے اپنے اکثریتی علاقوں میں آزاد قومی ریاستیں بنانے کا اختیار دیا جائے۔ اس سے دونوں تہذیبی جمعیتوں کو ایک دائمی نزاع سے نجات پانے اور اپنے اپنے طرزِ حیات کے مطابق زندگی گزارنے اور اپنی ترجیحی اقدار و روایات کو فروغ دینے کا موقع ملے گا۔ ظاہر ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے اقبال اپنی ترجیح کے مطابق مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے حصول میں سرگرم عمل ہو گئے۔ چنانچہ اقبال اور پھر قائدِ اعظم محمد علی جناح کی شبانہ روز مساعی کے نتیجے میں ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ کو دنیا کے نقشے پر وطن عزیز پاکستان ایک ٹھوس حقیقت کی صورت اختیار کر گیا۔ مجھے اس مرحلے پر زندگی کے آخری ایام میں بسترِ علالت سے محمد علی جناح کے نام لکھے ہوئے اقبال کے ایک خط کا وہ تاریخ ساز جملہ یاد آ رہا ہے جو تاریخی عمل کی رزم گاہ میں ''نعرہ بزن'' کا حکم رکھتا ہے۔ اقبال نے لکھا:

''کیا اب وہ وقت آ نہیں گیا کہ الگ وطن کا مطالبہ کر دیا جائے''

اور قائدِ اعظم نے بھی سارے تاریخی عمل کو ایک مختصر سے جملے میں بیان کرتے ہوئے کوزے میں دریا بند کر دیا تھا کہ

''پاکستان تو اسی روز بن گیا تھا جب پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا''

اقبال نے جب تصورِ قومیت اور نظریہ ریاست کی مروجہ تعریف میں نظریہ حیات کے مقصد جو متحرک عنصر کو کلیدی حیثیت سے شامل کیا تو اس وقت کے مغرب پسند، آزاد خیال اور سیکولر ذہنوں کے ساتھ ساتھ صرف وطنیت کو قوم کی بنیاد ماننے والے کانگریسی مسلم علما نے بھی اس کی شدید مخالفت کی۔ مگر اقبال نے اپنی ترجیحی مسلم قومیت کی اساس کو اجاگر کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

....

توحید و رسالت کو مسلم قومیت کی بنیاد بنانے پر معترضین کی طرف سے سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اگر دنیا کے تمام مسلمان ایک قومیت سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر الگ الگ مسلم

ریاستوں کے وجود کا کیا جواز ہے؟ اس سوال کا افکارِ اقبال کی روشنی میں جواب یہ ہو گا کہ دنیا کی تمام مسلم ریاستوں کے عوام ایک اسلامی قومیت سے وابستہ ہوتے ہوئے اسلام اور مختلف خطوں کی مقامی روایات کے تال میل سے تشکیل پانے والی متنوع وحدتوں کی نمائندگی بھی کرتے ہیں جن کے تشخص کا غالب داخلی و خارجی تہذیبی عنصر اسلام ہی رہتا ہے۔ اسے تہذیبی قومیت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ کثرت میں وحدت کا یہ تہذیبی عمل ایک بڑی تہذیبی اکائی کی متنوع ریاستی شناختوں کو بھی سامنے لاتا ہے۔ گویا ترکی، پاکستان، ایران افغانستان، مصر اور عراق وغیرہ ایک ہی عظیم اسلامی تہذیب کی ترکی اسلامی، پاکستانی اسلامی، ایرانی اسلامی، افغانی اسلامی، مصری اسلامی اور عراقی اسلامی شناختوں کی مختلف صورتیں اور شباہتیں ہیں۔

یہ بات بھی درست ہے کہ تشکیلِ پاکستان سے قبل ہم متحدہ ہندوستان میں ہند اسلامی قومیت کی وحدت سے وابستہ تھے اور ظہورِ پاکستان کے بعد آزاد و جمہوری وحدت میں ڈھل کر پاکستانی اسلامی قوم کی صورت اختیار کر گئے۔ اور اب ہم آزاد ریاست کے سائے تلے پاکستان میں شامل تمام ثقافتوں کے تال میل اور مشترک قومی ارادوں، فیصلوں اور بے ساختہ عوامی اظہارات سے اپنے ایک الگ اسلامی پاکستانی تشخص کے خد و خال ابھارتے چلے جا رہے ہیں۔ اس عمل میں اقبال کی روحانی جمہوریت کا تصور بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ہمارے وطنِ عزیز کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے اور ہمارے آئین میں شامل قرار دادِ مقاصد ایک سمت نما کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر ہماری روحانی جمہوریت اور اقبالی تصورِ قومیت کی توثیق کرنے والی یہ دونوں باتیں ہمارے ہشیار دشمنوں اور کوتاہ نظر نادان دوستوں کو بہت کھٹکتی ہیں۔

یہاں یہ بھی اچھی طرح یاد رہے کہ اقبال کے تصورِ قومی ریاست میں پاپائیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بل کہ اقبال تو یہ سمجھتا ہے کہ مسلم معاشرے کے عمرانی عمل میں پاپائیت کا امکان ہی نہیں ہے اور مسلم تاریخ بھی اس کی ٹھوس گواہی پیش کرتی ہے۔ اجتماعی آدرشوں کی بلندی تک کامل رسائی تو ممکن ہی نہیں ہوتی۔ تاہم درست سمت میں سفر جاری رہے تو عملی کامیابیوں کا ایک

تسلسل قائم و برقرار رہتا ہے۔ احسان اکبر نے اپنی ایک فکر انگیز نظم کی دو سطروں میں اس حقیقت کو کیا خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے:

ہم آگے بڑھتے جانے والے ایسے قافلوں سے ہیں
فقط جو سمت رکھتے ہیں کوئی منزل نہیں رکھتے

کسی بھی قوم یا معاشرے کے انسانوں کا تصور حیات ان کی اجتماعی اور سیاسی و معاشرتی زندگی پر اپنے اثرات ضرور مرتب کرتا ہے۔ وطنِ عزیز میں ہمارے عظیم تصور حیات کے زیر اثر بیسیوں مثبت، انسانیت نواز اور قابلِ فخر تہذیبی و ثقافتی مظاہر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے مگر موازنے کے لئے صرف اتنا ہی دیکھ لیجئے دیکھئے کہ ہمارے ہمسایہ ملک میں اگر ستر سے زیادہ برسوں کی مسلسل جمہوریت اور سیکولرزم کے دعووں کے باوجود منتخب بنیاد پرست سرکار کا قیام ایک بڑا سوالیہ نشان بنتا ہے تو ہمارے ہاں تمام انتخابات میں یہاں کے روشن خیال اجتماعی شعور کے مقابل بار بار ملائیت کا بری طرح رد ہونا کیوں لائقِ تحسین قرار نہ پائے۔ کیا یہ ایک حوالہ ہی دونوں قوموں کے تصور حیات اور اس کے اثرات کے فرق کو واضح کرنے کے لئے کافی نہیں۔

قومی ریاست کے حوالے سے اقبال کے تصور میں اعلیٰ اخلاقی و تہذیبی مقاصد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ رنگ، نسل، زبان اور جغرافیے کے محض زمینی عناصرِ ترکیبی سے آگے بڑھ کر اعلیٰ انسانی اقدار کو پیشِ نظر رکھنے والی نظریاتی قومی ریاست کو ترجیح دیتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ ریاست جیسا طاقتور ادارہ معاشرے کے اخلاقی و تہذیبی ارتقاع کا فریضہ ادا کرے۔ چنانچہ اس کے نزدیک اسلام صرف مذہب کے برعکس دین ہونے کے ناطے ایک مسلسل تہذیبی و معاشرتی تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ دین کی اصطلاح کو انسان اور معاشرے کی اخلاقی و تہذیبی بالیدگی کی خاطر کئے گئے روحانی عمرانی معاہدے سے تعبیر کرتا ہے۔ لہٰذا بے حد ضروری ہے کہ اس کے حرفِ سخن کی تفہیم و تعبیر بھی اسی زاویے سے کی جائے۔ اس کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہوگا کہ شاید یوں ہمارے آزاد خیال اور سیکولر دوست اقبال کے ایسے اشعار سے بدکنا چھوڑ دیں۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

☆☆☆☆☆

تابش دہلوی اور انتخابِ کلامِ تابش

نام سید مسعود الحسن، تخلص تابش۔ تابش دہلوی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ ۹ نومبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ۲۳ ستمبر ۲۰۰۴ء کو کراچی میں وفات پائی۔ حنفی العقیدہ تھے۔ قرآن مجید اور عربی فارسی سے شناسائی کے بعد مدرسہ عالیہ میں ابتدائی اور علیگڑھ سے ثانوی تعلیم حاصل کی۔ ۷ ستمبر ۱۹۴۹ء کو پاکستان ہجرت کی اور جامعہ کراچی سے بی اے کیا۔ حیدر آباد دکن کے پوسٹ آفس سے ملازمت کا آغاز کیا جہاں کی تہذیب و ثقافت نے اُن کی عادات و اطوار کو بنانے سنوارنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ابتداً میں آل انڈیا ریڈیو دلی اور تقسیم کے بعد ریڈیو پاکستان کے خبروں کے شعبہ سے منسلک رہے۔ اُن کی ذات میں تہذیب ڈیرہ جمائے رہتی تھی۔ وہ بہت رکھ رکھاؤ، متانت اور وقار والے شخص تھے لیکن غلط بات پر مصلحت اختیار نہ کرتے تھے۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے تمغۂ امتیاز حاصل تھا۔

تابش کے بزرگوں میں علم و ادب سے تعلق رکھنے والی شخصیات موجود رہیں۔ اُن کے پردادا مولوی نظام الدین نظامی شعر و ادب سے شغف رکھتے تھے۔ والدہ کے علاوہ دونوں بڑے بھائی نواب دہلوی اور لائق دہلوی بھی شعر کہتے تھے۔ خود تابش کی دوسری شریکِ حیات رشتہ میں غالب کی بھانجی تھیں۔ اس ماحول میں تابش کا شاعر ہونا قدرتی امر تھا۔ تابش نے تیرہ برس کی عمر میں مسعود تخلص کے تحت پہلا شعر کہا اور انیس برس کی عمر میں پہلی باقاعدہ نظم اور بائیس برس کی عمر میں پہلی مکمل غزل کہی۔ وہ ایک خاص رکھ رکھاؤ والی دہلی کی مستند اور ٹکسالی زبان کے پارکھ اور شاعر تھے جو کلاسیکی غزل کو کامیابی سے اکیسویں صدی تک لے کر آئے۔ انھوں نے اپنے شعری اظہار میں اپنے وقت کی روح پھونکنے کی حتی الوسع

خاور اعجاز

کوشش کی ہے جس سے نہ صرف اُن کی انفرادیت نمایاں ہُوئی بلکہ اُن کی شاعری میں تازگی کی ایک لہر مسلسل سفر کرتی نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے غمِ حیات سے ہی لطفِ زندگی کشید کیا اور اپنی غزل میں زندگی کے مثبت رؤیوں کی ترجمانی کی۔ اُن کی شاعری میں زندگی کے بارے میں جو ناقدانہ انداز ملتا ہے وہ بھی مثبت طرزِ خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔ سادگی کے ساتھ سہلِ ممتنع اُن کا خاص وصف تھا۔ وہ فنی پختگی کی ایسی منزل پہ تھے جہاں بھاری بھرکم الفاظ اور چمکیلی تراکیب کی ضرورت نہیں رہتی اُن کی غزل اعتدال پسندی کی مثال ہے اور وہ اپنی غزل میں ایک نفیس، متوازن اور متین شاعر کی حیثیت سے اُبھرتے ہیں۔ الفاظ کے مزاج داں تھے۔ خود بھی نفیس شخص تھے اور الفاظ کی نفاست کو بھی عزیز رکھتے تھے۔ کوئی لفظ شعر میں پُرشکن ہو جائے، یہ انھیں گوارا نہ تھا۔ اِس سے شاعری میں اُن کی سلیقہ پسندی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ فانی بدایونی کے معترف اور اُن کے ہم جلیسوں میں شمار ہونے کے باوجود فانی کی غمگینی کو قبول کرنے کے بجائے اُن کی شعریت کے قائل رہے سو فانی کی جھلک تابش کے کلام میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

انتخابِ کلام

لطفِ نظر سے تابش اِسے دیکھتے چلو
یہ زندگی بھی ایک تماشا ہے راہ کا

ترکِ تمنا کی ہے تمنا دل کی حالت کس سے کہیں
جیسے کسی آبادی پر دھوکا بھی نہ ہو آبادی کا

دل کو رعنائیِ غم بھی دے دی
آپ نے اپنے لیے کیا رکھا

محرومیوں نے خوب پناہیں تلاش کیں
مَیں تھک گیا جہاں اُسے منزل کہا گیا

جلوہ گاہِ ناز میں تابش نظر کی خیر مانگ
اِس طلسمِ رنگ و بُو میں دل تو کام آ ہی گیا

یہی حسرت ہے کہ وہ ایک نظر دیکھ تو لے
اور اُس نے کبھی اِس سمت اگر دیکھ لیا

مرے سخن کو نہیں سمجھا سننے والوں نے
سنا گیا ہُوں مگر دُور کی صدا کی طرح

خواہشِ زیست ہے فزوں تابش
موت کے دن قریب ہیں شاید

آئی تو ہوائے تازہ لیکن
تنکوں کی طرح بکھر گئے ہم

تابش سراغِ منزلِ ہستی بتائے کون
اَب گردِ کارواں بھی پسِ کارواں نہیں

تاریک تھی فضائے چمن ابر و باد سے
جب آشیاں جلا تو ذرا روشنی ہوئی

ہے جہدِ منفرد سبب کاروبارِ دہر
اِک اضطراب قطرہ ہے دریا کہیں جسے

اَب نہیں کوئی خوف اسیری کا
سو نشیمن تھے دام سے پہلے

طلب ہے شرط مگر رہبری ضرور نہیں
پہنچ ہی جائیں گے وہ بھی جو راہ پر نہ رہے

آنکھوں سے تو نہاں ہے مگر دلنشیں تو ہے
ہر چند ہر جگہ نہیں لیکن کہیں تو ہے

عمر بھر شام و سحر کا ایک ہی موسم رہا
دل یہاں آباد ہی کب تھا جو اَب ویرانہ ہے

ہزار عشرت آئینہ ہوں ترے جلوے
جو تیرے دیکھنے والے ہیں انجمن میں نہیں

رُخ ہی ہو جائے گا موسم کی ہَوا کا معلوم
ہمیں خاکسترِ دل اپنی اُڑا دیکھتے ہیں

مجھ کو تجدیدِ تماشا کا بھی دیتا ہے فریب
وہی جلوہ جو مرا دیکھا ہُوا ہوتا ہے

مَیں سُنتا ہُوں مگر واقف نہیں ہُوں
تری آواز آتی ہے کہاں سے

چھوٹی پڑتی ہے انا کی چادر
پاؤں ڈھکتا ہُوں تو سر کھلتا ہے

مانا جانکاہ بہت غم کا نہاں رکھنا ہے
غم کا اظہار تو شعلے پہ زباں رکھنا ہے

مَیں اسی دور میں کیا، زندہ ہر اک دور میں ہُوں
کب سے یہ گردشِ ایام مری تاک میں ہے

اپنی شادابیِ غم کا مجھے اندازہ ہے
روح کا زخم پرانا ہے مگر تازہ ہے

نیم نگاہی کیا سمجھائے
ساری بات ادھوری ہے

دل میں نفاذِ شوق کی طاقت کہاں سے لائیں
کوزے میں کیا طلاطمِ دریا اُٹھائیے

☆☆☆☆☆

عابد رشید کے نعتیہ مجموعے ''خیر الوریٰ'' کا ایک جائزہ

چند ماہ قبل ماورا پبلشرز جیسے معیاری ادارے سے شائع ہونے والا یہ خوب صورت نعتیہ مجموعہ ''خیر الوریٰ'' باون نعتوں، بارہ حمد و مناجات، پانچ حمدیہ و نعتیہ نظموں، چھ مناقب اور ایک سلام پر مشتمل عابد رشید کا تیسرا تقدیسی مجموعہ ہے۔ دو سو چوبیس صفحات کی معقول ضخامت کے ساتھ بہترین دبیز کاغذ اور بصیرت افروز سرورق کے ساتھ شائع ہونے والی اس کتاب کی پشتِ سرورق پر افتخار عارف، ڈاکٹر ریاض مجید، راقم السطور اور ڈاکٹر منیر الزماں منیر کے مختصر فلیپس ان کے مضامین کے مختصر اقتباسات پر مبنی ہیں۔ کتاب کے آغاز میں مصنف کے پیش لفظ کے علاوہ امریکہ میں مقیم ڈاکٹر توفیق انصاری احمد کا دیباچہ شامل ہے۔ دیگر شعرائے کرام کی تحریریں روایت سے قدرے انحراف کرتے ہوئے مضامین کی صورت میں کتاب کے آخر میں دی گئی ہیں۔ ان میں مذکورہ ناموں کے علاوہ مامون ایمن، پروفیسر محمد طاہر صدیقی، طاہر سلطانی، ایاز مفتی، ڈاکٹر سرور حسین نقشبندی اور نسیم شیخ جیسی معروف ادبی ہستیاں شامل ہیں، جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں مصنف کے تقدیسی و عقیدتی سفر کا جائزہ لیا اور اس کے محاسن کی نشان دہی کی ہے۔

نعت گوئی کی صنف کسی بھی شاعر کی شعر گوئی کا نقطۂ عروج اور اوجِ کمال سمجھا جاتا ہے۔ حضور کی ذاتِ اقدس سے اظہارِ عقیدت کو ایسے پیرائے میں بیان کرنا کہ وہ شاعر کی قلبی و روحانی کیفیات کا ترجمان بن جائے مگر حدِ ادب اور احتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، انتہائی اہم ہے اور جسے یہ پیرایۂ ادب و احتیاط نصیب ہو جائے، اس کی

نسیم سحر

خوش طالعی پر رشک آنے لگتا ہے۔
ان کے پہلے نعتیہ مجموعے سے لے کر تیسرے نعتیہ مجموعے تک عابد رشید کا ایک مسلسل تخلیقی سفر، اوراس تخلیقی سفر کے ارتقائی مراحل بڑے واضح اور سرشار کر دینے والے ہیں۔ عابد رشید نے عام اور مستعمل زمینوں میں بھی ایسے عمدہ تخلیقی شعر کہے ہیں جنہیں محض زورِ قلم یا ''شعری کسرت'' کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا، وہ نعت کی کسی ردیف کی زمین کو اور مصرع طرح کو اپنے آپ پر پوری طرح طاری کرتے ہیں، اُس پر مسلسل غور و خوض کرتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ ان کی تخلیقی زرخیزی کے سیلاب میں شامل ہو جاتا اور اسی سے نمو یاب ہو کر ایک ایسی عمدہ تخلیق میں ڈھل جاتا ہے جسے پڑھ کر یا سُن کر قاری اور سامع اسے 'آورد' نہیں، 'آمد' تسلیم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔
انھوں نے اچھوتی ردیفوں اور قافیوں کی تلاش کر کے اپنی نعتیہ شاعری کو ایک انفراد دینے کی شعوری اور قابلِ تحسین کوشش بھی کی ہے۔ ایک اچھے تخلیقی شاعر کا قلم جہاں طرحی اور ردیفی شاعری میں رواں ہوتا ہے وہیں اس کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ نئی ردیفیں اور نئے قافیے تلاش کیے جائیں کیونکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے کہ نئی ردیف اور نئے قافیے میں نئی بات کہنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کی ایک اور تخلیقی جہت بالکل نئی ردیفیں ہیں۔ ایسی اچھوتی ردیفوں کے ذریعے ایک منجھا ہوا تخلیقی شاعر نئے موضوعات اور نئی شعری جہت کے دریچے وا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چند ردیفوں میں عابد رشید کے چنیدہ اشعار ملاحظہ ہوں جنھیں پڑھ کر یہ لطیف احساس ہوتا ہے کہ عابد رشید نے ان نعتوں کے کیفیاتی اور تقدیسی منظر نامے میں ایسے نئے نئے رنگ بھر دیے ہیں جو کائناتِ نعت میں پہلے اگر موجود بھی تھے تو ان کی چمک دمک اتنی تابندہ نہیں تھی:

میں کہاں شمار میں تھا، مجھے چُن لیا کسی نے
میں کہیں غبار میں تھا، مجھے چُن لیا کسی نے

....

تُو مالکِ بحر و بر ہے مولا، تُو خالقِ خشک و تر ہے مولا
تُو میری منزل، تُو میرا رہبر، الٰہی اکبر، الٰہی اکبر

....

ہو مرے دل کا مدینہ بھی مدینہ یارب
اُن کے اسوہ کا ہو پرتُو مرا جینا یارب

....

اسی طرح نعتوں میں ان کی ردیفیں ایک تازگی اور فرحت کا احساس دلاتی ہیں، اِک طرف، ''سے لکھوں، شہِ والا، ہے اور میں

ہوں، سے پہلے، دل کی دھڑکنیں، آپ سا کون ہے، مل گئی ہے، بچپن سے، آپ یاد آگئے بات بنتی گئی، ان کے ان ردیفوں میں چند چنیدہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سلطنت، قصر و منارے، تاجِ شاہی اِک طرف
جَو کی روٹی، ایک کرتا اور چٹائی اِک طرف

آخرش اُن کی شفاعت پر ہے سب کچھ منحصر
سب نمازیں، روزے، ساری پارسائی اِک طرف

ثنائے فخرِ دو عالم کہاں کہاں سے لکھوں
خدا ہے اُن کا ثناخواں جہاں جہاں سے لکھوں

ہستی میں تلاطم ہے نہ مضطر ہیں دل و جاں
یہ آپ کی مدحت کا ہے احساں، شہِ والا

سحابِ نُور، بارانِ کرم ہے اور میں ہوں
مدینے کی فضا، اُن کا حرم ہے اور میں ہوں

ہواؤں میں رچی سرکار کی بھینی سی خوشبو
خیابانِ اِرم زیرِ قدم ہے اور میں ہوں

....

مجھ پہ سرکار کا خوب احساں ہوا اُن کے دربار کا میں ثناخواں ہوا
میں نے قرآں پڑھا، نعت بنتی گئی، آپ یاد آگئے، بات بنتی گئی
عابد رشید اپنی نعت گوئی کو آقا کی عطا اور کرم بجا طور پر سمجھتے ہیں:

قلزمِ عشق ہے اور سیلِ رواں مدحت کا
محوِ توصیف و ثنا، اہلِ قلم ہیں، میں ہوں

تجھے تاجِ سخن تیرا مبارک
مجھے مدحت سرائی مِل گئی ہے

....

معجزوں کا ذکر ہر شاعر کی تقدیسی شاعری کا ایک جزو لازم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی معجز نمائی کا اعتراف کیا جائے۔ تلمیحات و معجزات کا بیان نعتیہ شاعری کا ایک اہم حصہ ہے لیکن یہ ہر نعت گو شاعر کے بس کی بات نہیں کہ اس کے لیے قرآنِ پاک، تاریخِ اسلام کا مطالعہ کرنا اور ان تلمیحات و معجزات کی روح میں اترنا لازمی ہوتا ہے۔ عابد رشید کے یہ اشعار ان کی تاریخ کے گہرے مطالعے اور واقعاتی تناظر کی دلالت کرتے ہیں:

لمسِ حضور سے وہ بچھڑ کر جو رو دیا
سرکار نے ستون کی قسمت سنوار دی

جو اُن کی راہ میں ٹوٹا، تو جڑ بھی جاؤں گا
سکھا رہا ہے یہی ماہتاب، بچپن سے

....

ان کی نظمیں ایک الگ نوعیت کی نشاطیہ کیفیت کی کائنات میں قاری کو اپنے ساتھ

لے جاتی ہیں کہ ان میں موضوع کے تسلسل کو پورے تاریخی تسلسل اور تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ کسی دیباچے میں نظموں کے طویل اقتباسات دینے کی گنجائش نہیں ہوتی، قاری اس کتاب میں شامل یہ مکمل نظم پڑھ کر ہی اس کی عمدگی اور تاریخ بیانی کی دلگداز کیفیات سے آشنا ہو سکتا ہے۔ کسی بھی نظم کا مکمل ابلاغ درست سیاق و سباق میں اس کی بغور خواندگی ہی سے ممکن ہے۔

عابد رشید نے رسولِ کریم اور خلفائے راشدین کی شان میں مناقب بھی لکھے ہیں اور ان میں بھی ایک کمال کے ساتھ تخلیقی و تقدیسی رنگ بھرے ہیں۔ صرف یہی نہیں، وہ خلفائے راشدین کی سیرت و کردار اور فروغِ دین کے ساتھ ساتھ رسول کریم کے ساتھ ان کی محبت اور ان کی پیروی کا بیان بھی عمدگی سے کرتے ہیں۔

عابد رشید کی نعت گوئی کا مسلسل ارتقائی اور ارتفاعی سفر دیکھ کر میں یہاں نت نئی زمینوں اور ہیئتوں میں تقدیسی شاعری کرنے والے معروف نعت گو شاعر اور نقاد اشفاق احمد غوری کا یہ مختصر اقتباس دینا ضروری سمجھتا ہوں جو میری نظر میں عابد رشید کی تقدیسی شاعری پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے:

”جیسے ہر آہو کو نافۂ مشک عطا نہیں ہوتا اور ہر زمین گلاب کی کاشت کے لیے موزوں نہیں ہوتی، ویسے ہی محبتِ رسولؐ کا ارمغان ہر کس و ناکس کو عطا نہیں کیا جاتا بل کہ بہت خاص اور چیدہ قلب ہوتے ہیں جن میں یہ جوہرِ عطر بار و مشک سار سجایا جاتا ہے اور ب یہ گلابِ عشقِ محبتِ رسولؐ کسی شاعر کے قلبِ حساس میں نمو پذیر ہوتا ہے تو رگ حیات میں بہنے والے لہُو کی بوند بوند سے خوشبوئے نعت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور روم روم سے نعت کا ظہور ہوتا ہے۔“

عابد رشید کا یہ تیسرا نعتیہ مجموعہ ہے، اور کچھ عجب نہیں کہ اس کی اشاعت کے مراحل طے ہونے تک ان کا چوتھا مجموعہ ایک نئی شان، ایک نئے شعری اسلوب، ایک جدید تر لہجے اور جمالیاتی حسن کے ساتھ اشاعت کا منتظر ہو۔ میں ان کے اس مسلسل تخلیقی وفور اور اس کے ارتقائی و ارتفاعی مراحل کے اعتراف میں اپنا یہ شعر اُن کی نذر کر کے ان کے چوتھے نعتیہ مجموعے کے انتظار کی لطافت بھری کیفیت میں مبتلا رہوں گا:

مرے وجود کی سرحد پہ انتظار کرو
ابھی دکھاؤں گا دُنیا کو مَیں کمال اِک اور

☆☆☆☆☆

جاوید اختر چودھری کا ایک حیران کن افسانہ

ثقافتوں کا ادغام نیا بازیچہ نہیں، اگرچہ جدید رسل ورسائل اور ذرائع ابلاغ کے باعث اس عمل میں اب تیزی آگئی ہے۔ یوں جہاں کچھ ندامتوں نے فروغ پایا وہاں نئے تفاخر بھی سامنے آئے۔ اردو فکشن میں الگ الگ کلچرل قاشوں کو فکشن میں یکجا کرنے کا کامیاب تجربہ بھی ہوا۔ اس تعلق میں جاوید اختر چودھری کا نام بہت مؤثر قرار پائے گا۔ یہ پاکستانی نژاد افسانہ نگار کم وبیش نصف صدی سے یورپ میں مقیم ہیں۔ سو، دونوں تہذیبوں اور قدروں سے ان کی بلاواسطہ شناسائی ہے۔ دونوں خطوں سے وابستہ زیست کو براہ راست برتنا ان کے کام آیا۔ چنانچہ یہ پرت ان کے متعدد افسانوں میں خوبی سے جمع ہوئے۔

جاوید صاحب کے نمائندہ افسانے 'ٹھوکا' کو یہاں اس لیے حوالہ بنایا جائے گا کہ اپنے آبائی پیشے سے جڑت کا اظہار بعض اوقات ایک ایسا Barricade بن جاتا ہے جسے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ پیشوں سے منسوب سماجی درجہ بندی (Social Hierarchy) ایک پیمانہ تو نہیں رکھتی لیکن معاشروں میں یہ 'رینکنگ' ہمیشہ موجود ضرور رہی۔ یوں 'پدرم سلطان بود' کی گردان کئی نسلوں تک جاری ملے گی۔ اسی طرح کسی 'کم تر' کسب/ وعقیدے سے جدی نسبت کو چھپانے کے لیے سوجتن کیے جاتے ہیں۔ طبقات کی موجودی بنا سوسائٹی کا تصور کیا قائم ہوگا! لیکن یہی 'اونچ نیچ' بہرحیث کشاکش کو جنم بھی دے گی۔ اگر کہیں 'فخر ومباہات' مؤثر ملتے ہیں تو وہ بلاوجہ نہیں ہوتے۔ انھیں صدیوں کے تعامل نے قوت بخشی ہوتی ہے۔ اس لیے روایت سے مشتق پانا ایک 'خودکار عمل' جانیے۔ وہ کام جن سے کاسب کے حصے میں فراواں دولت آئے، معزز روزگار سمجھا جاتا رہا ___ یہ حتمی نہیں ___ لیکن ایک بدصورت حقیقت ضرور ہے۔

جمیل احمد عدیل

ہندوستانی معاشرتیں بالخصوص لاتعداد اکائیوں کی پیش کار رہی ہیں۔ نوآبادیات کے لیے یہ منظرنامہ توقع سے بڑھ کر مفید رہا۔ استعمار نے اس تقسیم کو مزید فروغ دیا۔ اس ضمن میں باقاعدہ تحریری ضوابط وجود میں لائے گئے؛ کتابیں لکھی گئیں؛ یوں ذات پات، پیشے، وفاداریاں--- سب دستاویزی شکل میں ڈھل گیا۔ ستم یہ ہوا کہ آج بھی اشراف و اجلاف کا تعین انھی 'مقدس اوراق' سے کیا جاتا ہے۔ جن کا بطورِ 'کمین' اندراج ہو گیا، وہ گویا سند ہو گیا۔ اہلِ حرفہ کو اس تواتر سے کمتر کہا گیا کہ یہ ثابت شدہ صداقت ہو گئی۔ جبکہ دستکار ہونا تو ہنرمندی کا مظہر ہے۔ اس طرح باعث توقیر لیکن Defacto کی دھونس---

جاوید اختر کے مذکورہ افسانے میں اسی 'نئی الواقعیت' کی ثقافت موضوع بنی ہے لیکن دو علاحدہ علاحدہ لوکیلز کو ایک دوسرے میں اس طرح ضم کیا کہ کہانیاں دو نہیں رہیں، واحد اکائی ہی متن بنی ___ معاشی خوشحالی کا خواب لیے ترقی پذیر ممالک سے ہجرت کر جانے والے اگر یورپ میں مالی لحاظ سے آسودہ ہو جائیں تو اپنی سماجی شناخت کو مستحکم کرنے کے لیے کچھ اضافی سرگرمیوں میں ضرور حصہ لیتے ہیں۔ جو مناسب تعلیم یافتہ ہیں انھیں علم و ادب کی منزل دو قدم پہ دکھائی دیتی ہے۔ شاعر ادیب ہونا انھیں لبھاتا ہے۔ اس کہانی کی ابتدا بھی یہی دلچسپ احوال لیے ہوئے ملے گی۔ واحد متکلم اپنے قریبی تارکِ وطن احباب کے ہمراہ ایک مشاعرے میں شریک ہے۔ یہ شوقیہ سخن ور مجلسی وقفے سے مستفید ہوتے ہوئے برمنگھم، نیو کاسل، کشمیر--- کو تقابل میں لاتے ہیں کہ وطن مالوف کی شمع روشن رکھنے کے لیے کیسے یہاں پاکستانی ثقافتی مشاغل اپنی اہمیت اجاگر کر رہے ہیں۔ ایک صاحب نے اس ضمن میں اپنے شہر جہلم کے بڑھئی کا قصہ چھیڑا تو وہی اس افسانے کا ماجرا بنتا چلا گیا۔ سب اس سرگزشت میں اس لیے رفتہ رفتہ کھو گئے کہ وقوعے کی اٹھان ہی اچھوتی تھی۔ راوی نے جو سنا اس کا ملخص یہ ہے: منگلا ڈیم بننے سے قبل ملک کی سب سے بڑی لکڑی منڈی جہلم شہر تھا۔ جب اس شہر کا کوئی وسنیک ذاتی گھر کی تعمیر کا ارادہ کرتا تو وہ بالعموم امام بخش نامی ترکھان کی خدمات حاصل کرتا۔ یہ معمر کاریگر کمال کا چوب شناس ہی نہیں اپنے فن پر فاخر بھی تھا:

بڑھئی کے پاس ایک تیسہ، آری، رندہ اور ایک دو فٹا ہو تو دنیا کے کسی بھی کونے میں وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکتا ہے۔

(ٹھوکا/ص:۵۲)

اس صناع کو تین اولادیں نصیب ہوئیں: دو بیٹے اور ایک بیٹی- وہ تو سب کو اعلا تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتا تھا مگر حادثاتی موت نے یہ سپنا پورا نہ ہونے دیا- بڑے بیٹے کریم بخش نے تو باپ کی طرح فرنیچر سازی جاری رکھی البتہ چھوٹے لڑکے رحیم بخش نے کالج میں داخلہ لے لیا- محنتی اور ذہین تھا، یوں تعلیمی منزلیں کامیابی سے طے کرتا رہا-

افسانے میں وہ مرحلہ جاذبیت بلکہ ڈرامائیت کا حامل قرار پائے گا، جس میں واقعہ سنانے والے قمر نامی شاعر کو بکی کا سامنا کرنا پڑا- اب یہ موصوف Vanity Publication کے تحت شعری مجموعہ چھپوا کر اتراتے پھرتے تھے- دریں اثنا پاکستان گئے تو ان کی ہمشیر نے بتایا کہ گھر میں ان دنوں ایک ووڈ ورکر وارڈ روب بنا رہا ہے- اس نے متذکرہ شعری مجموعہ دیکھا تو پڑھنے کے لیے لے گیا- جب کتاب واپس کی تو اپنی تنقیدی رائے کا اظہار بھی کر دیا- جس کے مطابق اشعار میں کئی تکنیکی نقائص ہیں- ظاہر ہے یہ سن کر شاعر تلملا کر رہ گئے کہ ایک معمولی بڑھئی کی یہ مجال! جب بڑھئی سے ان کا آمنا سامنا کرایا گیا تو اس جواں سال ترکھان نے بڑی شائستگی کے ساتھ اپنا موقف دیا:

نہیں صاحب میں کہاں کا نقاد ہوں- البتہ کتاب کے مطالعہ کے دوران چند غزلوں میں قافیے کی گڑبڑ نظر آئی تھی اور چند غزلوں کے اشعار میں مصرع اول اور مصرع ثانی کی بحروں میں فرق نظر آیا تھا- بہت ممکن ہے مجھے ہی مغالطہ ہوا ہو-

چونکہ شاعر علم عروض سے خاص واقفیت نہیں رکھتے تھے چنانچہ انھیں مباحثے سے گریز ہی میں عافیت دکھائی دی- جب بڑھئی سے مزید تعارف طلب کیا گیا تو اس نے یہ بتا کر حضرت قمر کو حیران کر دیا:

میں نے ایم اے انگریزی ادب کیا تھا--- میں اسلام آباد میں انکم ٹیکس کے محکمے میں ڈپٹی کمشنر ہوں- پانچ دن اسلام آباد میں گزارتا ہوں اور ویک اینڈ پر یہاں جہلم شہر میں فرنیچر بنانے کا کام کرتا ہوں-

(ص:۵۷)

اب یہ اس قدر چونکا دینے والا تھا کہ شاعر: تک تک دیدم دم نہ کشیدم! کی تصویر بن کر رہ گیا! جب اس کا وزٹنگ کارڈ پڑھا تو اور تعجب ہوا کہ نام تھا:

رحیم بخش ٹھوکا

استفسار پر معلوم ہوا 'ٹھوکا' خاندانی نام نہیں بلکہ ترکھان کو تحقیر کے ساتھ پنجابی میں 'ٹھوکا'

کہا جاتا ہے: منجھیاں پیڑھیاں ٹھوکنے والا!......! ان صاحب نے صرف وزٹنگ کارڈ ہی پر نہیں اپنے دفتر کے دروازے پر بھی یہی تختی لگوا رکھی تھی:

رحیم بخش ٹھوکا

ڈپٹی کمشنر انکم ٹیکس

اس عجیب الوقوع صورت حال کی وضاحت یہ سامنے آئی کہ متعلقہ محکمے کے اہلکار ڈی سی کو اس کی عدم موجودگی میں طنزاً 'ٹھوکا صاحب' کہتے تھے۔ یعنی ایک ترکھان کا بیٹا ہونے پر حقارت کا اظہار! جب اسے اپنے بارے یہ علم ہوا تو خجل ہونے کے بجائے اس نے موروثی کام کو اعلانیہ اون کیا۔ صرف اس باعث نہیں کہ اس کے اجداد نجار تھے بل کہ اس نے خود بھی یہ آرٹ سیکھ رکھا تھا:

اب جب مجھے لوگ 'ٹھوکا صاحب' کہتے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ ایک فخر کا احساس ہوتا ہے۔ میرے ابا کیلیوں کو ٹھوکا کرتے تھے اور میں گیلی فروشوں اور ٹیکس چرانے والوں کو ٹھوکتا ہوں۔

(ص: ۵۸)

افسانے کی کہانی بلاشبہ بہت نادر ہے۔ البتہ ٹیکسٹ کے مجموعی تاثر سے قدرے ہٹ کر دو ایک سوالات شاید قابلِ توجہ ٹھہریں۔ ایک تو یہ کہ نجاری کیا واقعی گھٹیا پیشہ ہے؟ مثالی ذہن برجستہ یہی جواب دے گا: بالکل نہیں! یہ درست ہونے کے باوجود سادہ جواب ہوگا۔ درحقیقت متذکرہ سوال میں زاویہ داری یہ مضمر ہے کہ جو: ترکھان/بڑھئی/نجار ہے، اسے یہ تسمیہ کیوں برا لگے گا کہ وہ یہ کام اپنے اطمینان کے ساتھ کر رہا ہے۔ حتا کہ اگر کوئی استخفاف کے ساتھ اسے 'ٹھوکا' بھی کہہ ڈالے تو وہ 'عطائے تو بہ لقائے تو!' کے مصداق مخاطب کو یہ جواب دے سکتا ہے:

ہاں[1] میں ٹھوکا ہوں؛ لاؤ اپنی منجھی پیڑھی؛ ابھی ٹھوک دیتا ہوں!

یہاں ظاہر ہے اس طرزِ تخاطب میں اس کا اسم مذکر/فاعل ہونا بھی مدد کر رہا ہوگا۔

اصل قضیہ یہ کہیے کہ جہاں نسل در نسل یہ حرفت چلی آ رہی تھی وہاں Skilled Craftsman ہونا تو وجہِ امتیاز تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب اسی خاندان سے ایک سپوت مروج معاشرتی معیار کے مطابق 'بڑا آدمی' بن جاتا ہے تو اس کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ ایک پیشہ ور ترکھان تو بلاشبہ نادم ہوئے بغیر اپنی مہارت میں مگن ہے۔ اب اس کا بیٹا افسر بن کر کیا کرے؟ اس ماجرے نے اگر شاندار افسانہ بننا منظور کیا تو اسی کارن کیا کہ ایک اعلا/بااختیار عہدیدار نے نجار زادہ ہونے کو برملا قبول کر لیا۔ ورنہ کتنے ہی: حجاموں، موچیوں، درزیوں، مستریوں،

باورچیوں، دھوبیوں، قصابوں، لکڑہاروں، معماروں، مزدوروں، لوہاروں، کنجڑوں، قلعی گروں، للاریوں، جولاہوں، ہاریوں، تیلیوں--- کے بیٹے 'اونچے منصبوں' پر فائز ہونے کے بعد اپنی اصلیتوں کو چھپانے میں مصروف مل ہی جائیں گے-ا

سماج ذات/ پیشے پر جب مطعون کرتا ہے تو خجالت جنم لیتی ہے- حتا کہ جب کوئی مالدار ہو جائے، سرفراز سرکاری رتبہ مل جائے اور اس سے کوئی معمولی حرکت سرزد ہو جائے تو فوراً زبانوں پر آئے گا: رہا نیچ کا نیچ! جبکہ بشری تقاضے کے تحت اسفل عمل کسی سے بھی ہو سکتا ہے - خاندانی رسا کو ہمیشہ Privilege حاصل رہا- یہ استحقاق سدا کیش ہوتا آیا- یوں اس کی جانب عمومی جھکاؤ بے وجہ نہیں-

'ٹھوکا' میں کبیری کردار رحیم بخش نے اصل استفادہ ڈپٹی کمشنری سے کیا ہے- یہ کہنا شاید مسترد نہ ہو سکے کیونکہ تکنیکی سطح پر یہ افسانہ پیراڈوکس نے بنایا ہے- ایک طرح سے اسے طے سمجھیے کہ متداول سماجی معیارات کے مطابق سول سروس سے وابستگان بلند درجے میں شمار ہوتے ہیں- رحیم بخش نے اپنے Ambition اور باپ کی تمنا کے تحت وہی تعلیم حاصل کی جو معاشرتی توقیر پر منتج ہوتی ہے- وہی مقابلے کا امتحان پاس کیا، جس میں کامیاب ہونے والوں کو سوسائٹی سر آنکھوں پہ بٹھاتی ہے- قابل رشک حکومتی حیثیت ہی سے اس نے اتنی قوت کشید کی کہ اپنی نیم پلیٹ پر 'ٹھوکا' لکھواتے ہوئے اسے کوئی پشیمانی لاحق نہیں ہوئی- اگر وہ پوسٹ مین یا پرائمری سکول میں ٹیچر ہوتا تو شاید وہ اپنے نام کے ساتھ 'ٹھوکا' لکھنے کی ہمت نہ کر پاتا- علاوہ ازیں اس کی یہ جرأت اسی لیے بنظر تحسین دیکھی گئی کہ وہ ڈپٹی کمشنر ہے- ایک 'پریکٹیشنر کارپینٹر' کیا اپنی دکان/ورک شاپ کے باہر خود کو 'ٹھوکا' لکھوا سکتا ہے؟ کامیاب ہو جانے کے بعد ہی پورے اعتماد کے ساتھ اپنی ناکامی کی داستان سنائی جاتی ہے- کیا کسی خائب و خاسر کی دردبھری کہانی کسی نے شوق سے سنی ہے؟ نوآبادیاتی دور میں کرسی میز کو ریاستی سرپرستی حاصل ہوئی- بیوروکریسی (میزوں کی حکومت) کو اختیارات کے ساتھ غالب رکھا گیا- یہ حاکمیت کی ثقافت تھی- ادھر محکومیت کی ثقافت اور بھی پروان چڑھائی گئی ___ خوئے غلامی کو منہا نہیں کیا جا سکتا ___ اس طرح جو طبقے کمتر/ نیچ/ پست / گھٹیا / رذیل--- قرار دے دیے گئے وہ اپنے مقدر کے حامل ٹھہرے- دست کار بھی

اسی لپیٹ میں آئے۔ یوں جو اپنے ہنروں کے سبب معاشرے کے لیے کارآمد تھے، انھیں: نائی، دھوبی، موچی۔۔ کہہ کر بے قدری بل کہ اہانت کا نشانہ بنایا گیا۔ لکڑی کی فن کارانہ تراش سے کرسی میز بنانے والا 'ٹھوکا' ہو گیا اور اسی کرسی پر براجمان کلرک یا جج 'صاحب بہادر'(۲) کہلایا۔

معاشرے کی رگوں میں کسی طرز احساس کو اتارنے کے لیے حکومتی پالیسیاں خاص کردار ادا کرتی آئی ہیں۔ کولونیل عہد میں 'تھنک ٹینک' نے اذہان کی جو ساخت بنانا چاہی، وہ بے شک اس میں کامران رہا آج وہی فرمودے استناد کا محل رکھتے ہیں۔ جاوید اختر کا یہ افسانہ واحد قرات میں نہیں نمٹایا جا سکتا۔ ایک سے زاید ثقافتی اطراف کو محیط اس فن پارے کو اگر سراہا گیا ہے تو یہ اعتراف بلاوجہ نہیں!!(۳)

حواشی

۱۔ یہ سب معزز لوگ ہیں ان کے پیشے نہایت قابل احترام! جس کے دل میں ان کے لیے تکریم نہیں وہ متکبر شخص ہے۔ لائق نفرت!

۲۔ یہ لقب/خطاب بھی بے حد مضحکہ خیز رہے ہیں۔ جو پٹھان کے صلب سے نہیں وہ 'خان زادہ' کیسے ہو گیا؟ شاہ کا بیٹا نہ ہونے کے باوجود خود کو یا کسی کو 'شاہ زادہ/شہزادہ' کہنا عزت کا کون سا پہلو رکھتا ہے! تسمیوں سے فرار اور تسمیوں کی پناہ گاہ ـــــ دونوں احساس کمتری کے شاخسانے ـــــ نائی، کم حیثیتی کا مظہر، باربر (Barber) سرخاب کا پر ـــــ ہیئر کٹنگ سیلون ـــــ اب کوئی مضائقہ نہیں! فرد کو خود بھی عزم و دلیری کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ قواعد کے اعتبار سے اسمیت (Nominalism) کی نفی مقصود نہیں لیکن سماجی تعینات میں اسے آسانی تو نہیں سمجھا جا سکتا۔

۳۔ 'ٹھوکا' ایک انتہائی خوب صورت افسانہ ہے۔ جس میں انھوں نے جہلم شہر کے ایک بڑھئی امام بخش کی کہانی بیان کی ہے جو ایمان دار، صاف گو اور رزق حلال کمانے کے لیے مشہور تھا۔ اس کے بیٹے رحیم بخش نے کس طرح پڑھ لکھ کر اور ترقی کر کے اپنے باپ کا نام روشن کیا۔ افسانہ نگار نے بڑی فن کارانہ خوبی و مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ معمولی اور ان پڑھ لوگ بھی کس طرح اپنے بچوں کو اچھی تربیت کر کے انہیں کامیاب اور مثالی بنا دیتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اس بات کو بڑے مؤثر انداز میں اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک اچھا اور مؤثر افسانہ ہے۔ (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

☆☆☆☆☆

"اختلاف اللسان": ڈاکٹر ارشد اویسی کا ایک تدوینی کارنامہ

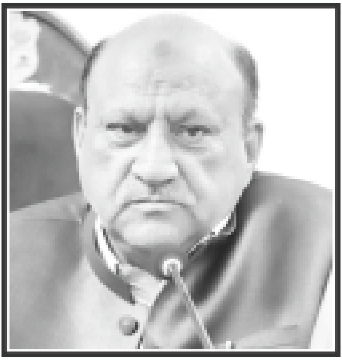

زندہ زبانوں میں زمانی و مکانی ہر دو اعتبار سے الفاظ و تراکیب، محاورات، املا و تلفظ، تذکیر و تانیث اور واحد جمع جیسے لسانی معاملات و مسائل میں نت نئے تغیر و تبدل اور اضافہ جات و ترامیم کا ارتقائی سفر جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ ارتقائی سفر نہ صرف کسی زبان کے لسانی جغرافیے میں وسعت اور پھیلاؤ کی دلیل ہے بل کہ تاریخی اعتبار سے عوامی سطح پر اس زبان کی قبولیت اور مقبولیت کا معیار متعین کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

اردو زبان قدرے کم عمر زبان ہونے کے باوجود تاریخی و جغرافیائی اعتبار سے یہ شان رکھتی ہے کہ مذکورہ تاریخی و جغرافیائی معیارات کو مدنظر رکھا جائے تو یہ زبان افقی و عمودی سطوح پر ہمیشہ ارتقا پذیر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف زمانوں میں اس زبان کے لسانی و ادبی دبستان وجود میں آتے رہے ہیں۔ ابتدائی طور پر دیکھا جائے تو جنوبی ہندوستان میں دبستانِ دکن اور شمالی ہندوستان میں دہلی اور لکھنؤ کے دبستان بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کے وابستگان نے اردو کے لسانی و ادبی معیارات قائم کرنے میں بہت بنیادی نوعیت کی خدمات سرانجام دیں۔ ان دونوں دبستانوں سے تعلق رکھنے والے نہ صرف شاعروں ادیبوں نے اردو کی شعری و نثری اصناف کی ہیئتی و اسلوبیاتی حوالے سے معیار بندی کی بل کہ ہر دو شہروں میں عوامی سطح پر اردو بول چال اور محاورہ سازی کی لسانیاتی تشکیل نے بھی مختلف ارتقائی مراحل طے کیے۔

دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کو تاریخی تناظر

نذر عابد

میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی و تمدنی اعتبار سے مختلف المزاج فضاؤں کا سامنا رہا۔ ماحول و مزاج کا یہ اختلاف اردو زبان کے الفاظ و تراکیب کے استعمال، املا و تلفظ کے معیار، محاورات کی تشکیل، اسما کی تذکیر و تانیث اور واحد جمع کے برتاوے میں بھی جھلکتا ہے۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ فصاحت و بلاغت کے تناظر میں دونوں دبستانوں کا لب و لہجہ اور لسانی برتاؤ معتبر ٹھہرتا ہے۔

دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کی اردو لسانی و ادبی خدمات پر مختلف محققین و ناقدین نے دادِ تحقیق و تنقید دی ہے۔ ان دبستانوں کے مابین پائے جانے والے لسانی اختلافات کے حوالے سے منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی کی کتاب "اختلاف اللسان" ایک اہم تصنیف ہے جو ۱۹۲۰ء میں اولین بار زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی لیکن بدقسمتی سے ۱۹۶۰ء کے بعد دوبارہ اس اہم تصنیف کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی اور یوں رفتہ رفتہ یہ کتاب نایاب ہوتی چلی گئی۔

محبانِ اردو کے لیے یہ بات باعثِ اطمینان و مسرت ہوگی کہ "اختلاف اللسان" جیسی اہم تصنیف عصرِ حاضر میں اردو کے معروف محقق اور مدون پروفیسر ڈاکٹر ارشد اویسی کے ذوقِ تحقیق کے نتیجے میں نئی صورت میں مرتب ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی اس کتاب میں ڈاکٹر ارشد اویسی نے صاحبِ تصنیف منشی وجاہت حسین وجاہت کے حالاتِ زندگی اور ان کی زیرِ نظر تصنیف کے مندرجات کے حوالے سے اپنا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل کیا ہے۔ اس مقدمے میں قاری کو تصنیف و صاحبِ تصنیف کے حوالے سے اہم اور بنیادی معلومات میسر آتی ہیں۔

مقدمے کے بعد کتاب کا اصل متن شامل ہے جس کی ترتیب یوں ہے کہ صاحبِ تصنیف وجاہت حسین وجاہت کا ایک صفحے پر مشتمل ابتدائیہ اور آٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی "تمہید" شامل ہے جس میں صاحبِ تصنیف کی طرف سے کتاب کے تعارفی مباحث تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد الف بائی ترتیب سے ۵۰۲ الفاظ کی تذکیر و تانیث کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ان ۵۰۲ الفاظ میں سے ۲۸۱ الفاظ کا تعلق لکھنؤ جب کہ ۱۲ الفاظ کا تعلق دلی سے ہے۔ اس فہرست میں الفاظ کے علاوہ تراکیب اور محاورات کے معانی بھی شامل کیے گئے ہیں۔ صاحبِ تصنیف نے دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کے حوالے سے الفاظ و تراکیب کے معانی اور تذکیری و تانیثی اختلافات پر مفصل بحث کرتے ہوئے مختلف مستند لغات سے استفادہ بھی کیا ہے اور استناد کے طور پر مختلف اساتذہ کے متعلقہ اشعار بھی درج کیے ہیں۔ یوں کتاب میں کی گئی تمام تر بحث کی استنادی حیثیت دو چند ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

''بیاض'' کے ساتھ گزرے ماہ و سال

تین دہائیاں ہوتی ہیں۔ میں ''بیاض'' کے دفتر میں موجود تھا۔ ''بیاض'' جہاں سے میں نے 30 سال قبل اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ میں لاہور گیا تو میرے ادبی شوق کو دیکھتے ہوئے مجھے کچھ دوستوں نے ''بیاض'' کے مدیر اور معروف شاعر خالد احمد سے ملنے کا مشورہ دیا تو میں محترم خالد احمد سے ملنے چلا گیا۔ وہ بہت محبت سے پیش آئے۔ اسی دوران دو بہت خوب صورت شخصیات عمران منظور اور نعمان منظور بھی شامل گفتگو ہوئے۔ آج جب میں ''بیاض'' کے دفتر پہنچا تو عمران منظور کی محبت اور شفقت کے بعد محسوس ہوا جیسے وقت نے ایک دائرہ مکمل کر لیا ہو اور میں پھر اُسی احساس کے ساتھ لوٹ آیا ہوں جہاں ''بیاض'' سے میرا محبت اور خلوص کا رشتہ اُستوار ہوا تھا۔ پہلی بار ۱۹۹۲ میں جب میں بیاض کے دفتر گیا تو میں نے اپنی پہلی نظم ''مائیں بیچا کرتی ہیں'' اور اپنا پہلا افسانہ ''خواہش'' محترم خالد احمد کو اشاعت کے لیے پیش کیے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ خالد احمد نے میری نظم اور افسانے کی تعریف کی تو میں نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا میرا اس میں کمال نہیں۔ چونکہ نظم اور افسانہ کے مضامین ماں کے ساتھ محبت کے گرد گھومتے ہیں تو ماں کی محبت میں لکھی جانے والی کوئی بھی تحریر معیاری ہی دکھائی دے گی۔

میرا ماہنامہ بیاض، سے تعلق ایک خوب صورت اور یادگار سفر ہے۔ یہ محض ایک ادبی رسالے سے وابستگی نہیں بل کہ ایک فکری، ادبی اور قلبی رشتہ ہے جس نے میری سوچ، تحریر اور شخصیت کو گہرائی عطا کی۔ اس تعلق کی بنیاد خالد احمد، عمران منظور اور نعمان منظور جیسی شخصیات کے ساتھ جڑی ہوئی ہے جن سے میرا تعلق احترام اور ادبی رفاقت پر مبنی رہا۔ تیس سال پہلے کی وہ ملاقات کا وہ لمحہ آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے جب دفتر میں موجود تمام افراد کے چہروں پر خلوص اور محبت کی روشنی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی ادارے میں نہیں بل کہ ایک ادبی گھرانے میں داخل ہوا ہوں جہاں ہر شخص

طلعت شبیر

دوسرے کے لیے احترام اور شفقت رکھتا ہے۔ خالد احمد کی شخصیت میں سنجیدگی اور گہرائی تھی۔ وہ نہایت متوازن گفتگو کرتے اور شعر و ادب کے موضوعات پر ان کی بصیرت قابلِ رشک تھی۔ عمران منظور میں ایک خاص طرح کی گرمجوشی اور دوستانہ پن تھا۔ نعمان منظور کی طبیعت میں تخلیقی جوش اور جدت کا عنصر نمایاں تھا۔ اُن کے خیالات میں تازگی اور انداز میں انفرادیت تھی جو بعد میں اُن کی ادبی نگارشات میں سامنے آئی۔ اِن شخصیات کا اخلاق، گفتگو، رویہ اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ متاثر کن تھا یہی وجہ ہے کہ ''بیاض'' نئے لکھنے والوں ایک اچھا پلیٹ فارم ثابت ہوا۔ ''بیاض'' سے میرا تعلق وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتا چلا گیا اور تین دہائیوں پر محیط اِس سفر میں ادبی منفعت کے علاوہ میں نے بہت سی خوب صورت یادیں بھی سمیٹیں۔

اُردو ادب کی دُنیا میں خالد احمد کا نام ایک سنجیدہ، باوقار اور فکری وابستگی رکھنے والے قلمکار کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اُن کی ادبی و صحافتی خدمات میں ماہنامہ بیاض کے ساتھ اُن کا تعلق خاص اہمیت رکھتا ہے اور اُن کی وابستگی نے رسالے کے معیار کو بلند کیا۔ ماہنامہ بیاض کے ساتھ خالد احمد کی وابستگی محض ادارتی ذمہ داری تک محدود نہیں رہی بل کہ اُنھوں نے اسے ایک فکری پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا۔ اُن کی ادارت میں ''بیاض'' نے معیاری ادب، سنجیدہ تنقید اور سماجی شعور کو فروغ دیا۔ اُنھوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ رسالہ سطحی تحریروں کے بجائے ایسی تخلیقات شائع کرے جو قاری کی فکر کو جِلا بخشیں۔ خالد احمد کی سب سے بڑی خوبی اُن کی تنقیدی بصیرت تھی۔ ''بیاض'' کے صفحات پر اُن کی نگرانی میں شائع ہونے والی تحریریں نہ صرف ادبی لحاظ سے مضبوط ہوتی تھیں بل کہ اُن میں عصری مسائل کی جھلک بھی نمایاں ہوتی تھی۔ اُنھوں نے ادب کو معاشرے سے جوڑنے کی کوشش کی اور اس بات پر زور دیا کہ ادیب اپنے عہد کے تقاضوں سے غافل نہ رہے۔ خالد احمد کی ادارت میں بیاض نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ کئی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ''بیاض'' میں شائع ہوئیں جو بعد میں اُردو ادب کے معتبر ہوئے۔ اِس طرح یہ رسالہ ایک ادبی درسگاہ کا کردار بھی ادا کرتا رہا۔ خالد احمد کی ادارت میں ''بیاض'' نے روایت اور جدت کے درمیان توازن برقرار رکھا۔ ایک طرف کلاسیکی ادب کی قدر و قیمت کو اجاگر کیا گیا تو دوسری طرف جدید ادبی رجحانات کو بھی جگہ دی گئی۔ یہی توازن ''بیاض'' کی پہچان بنا اور اسے دیگر ادبی رسائل سے ممتاز کیا۔ خالد احمد کی فکر نے بیاض کو ایک معتبر اور باا ثر ادبی جریدہ بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا اور اِسے اُردو ادب میں ایک روشن مثال کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اُردو کی تاریخ میں ادبی رسائل نے ہمیشہ فکری وتہذیبی شعور کی آبیاری میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور "بیاض" اس سلسلے کا ایک اہم نام ہے جس نے نہ صرف ادبی روایت کو زندہ رکھا بل کہ شاعروں اور ادیبوں کو بھی اظہار کا پلیٹ فارم فراہم کیا۔ "بیاض" کی ابتدا ایک ایسے دور میں ہوئی جب اُردو ادب کو سنجیدہ فکری مباحث اور معیاری تخلیقی اظہار کی ضرورت تھی۔ اس رسالے نے اپنے قیام کے آغاز ہی سے اعلیٰ ادبی اقدار کو فروغ دینے کا عزم کیا۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین، افسانے، شاعری اور تنقیدی تحریریں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ "بیاض" نے ادب کو محض تفریح نہیں بل کہ فکری تربیت کا ذریعہ سمجھا۔ "بیاض" کا ایک نمایاں کردار یہ رہا کہ اس نے قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک پل کا کام کیا۔ اس نے کلاسیکی ادبی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے جدید رجحانات کو بھی خوش آمدید کہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے صفحات پر ہمیں ایک طرف روایتی غزل کی خوشبو ملتی ہے تو دوسری طرف جدید نظم اور افسانے کی تازگی بھی محسوس ہوتی ہے۔ بیاض نے سنجیدہ تنقیدی مباحث کو فروغ دیا جس سے قاری کی فکری سطح بلند ہوئی اور ادب کو سمجھنے کے نئے زاویے پیدا ہوئے۔ اس رسالے نے ادیبوں اور قارئین کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کیا جو کسی بھی ادبی معاشرے کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ آج کے ڈیجیٹل دور میں "بیاض" جیسے رسائل کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ ہمیں ہماری ثقافتی اور ادبی جڑوں سے جوڑے رکھتے ہیں اور فکری بالیدگی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ادبی رسائل ادبی روایت، فکری تحریک اور تہذیبی ورثہ ہوتے ہیں جن کا اگلی نسلوں تک منتقل ہونا ضروری ہے۔

عمران منظور اور نعمان منظور نے "بیاض" کی آبیاری میں جس اخلاص، تسلسل اور فکری دیانت کا مظاہرہ کیا ہے وہ ایک عظیم ادبی خدمت ہے۔ آج کے دور میں جب ادبی رسائل کی روایت دم توڑ رہی ہے تین دہائیوں سے زائد عرصے تک ایک ادبی مجلّے کو زندہ رکھنا سہل کام نہیں ہے۔ اس تسلسل کے ساتھ اشاعت بیاض کی ٹیم کی محنت، ذوقِ جمال اور ادب سے غیر مشروط محبت کا ثمر ہے۔ مستقبل میں "بیاض" کو ایک باقاعدہ ادارے کی شکل دینا نہ صرف وقت کی ضرورت ہے بل کہ اس ادبی ورثے کے تسلسل کی ضمانت بھی۔ اگر یہی جذبہ اور نظم و ضبط برقرار رہا تو یہ مجلّہ آئندہ بھی اسی شان سے شائع ہوتا رہے گا اور نئی نسلوں کو ادب سے جوڑنے کا ذریعہ بنتا رہے گا۔ چھتیس برس کی مسلسل اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ بیاض کو ادارہ جاتی بنیاد حاصل ہو چکی ہے۔ اپنے ادبی وثقافتی ورثے کو زندہ رکھنے کے لیے ایسی کوششوں کی حوصلہ افزائی جاری رکھنا ازحد ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆

سلور سکرین کا زوال: منی سکرین اور ادب کا امتزاج

متحدہ ہندوستان میں سلور سکرین یعنی سینما کلچر کا آغاز 1913 میں دادا صاحب پھالکے نے پہلی مکمل فلم ''راجہ ہریش چندر'' کی ہدایت کاری کے ذریعے کیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ممبئی (بمبئی)، کولکتہ (کلکتہ)، چنائی (مدراس) اور لاہور فلم سازی کے بڑے مراکز بنتے گئے۔ ممبئی اور لاہور اس فہرست میں فلم سازی کی صنعت کے عظیم ترین مرکز تھے۔ پھر 1947 کے بعد لاہور کے ساتھ بیشتر ڈھاکہ اور ثانوی طور پر کراچی سلور سکرین کو چمکانے میں مصروف رہے۔ تاہم لاہور کے سرِفہرست ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جیسے بمبئی کی مناسبت سے بھارتی فلمی صنعت بولی ووڈ کہلاتی ہے، اسی طرح پاکستان میں اسے لاہور کے غلبے کے سبب لالی ووڈ کا نام ملا۔ یہ ایک اہم اور تحقیق طلب معاملہ ہے کہ بالی ووڈ کے مقابلے میں لالی ووڈ وقت کے ساتھ ساتھ کیوں بہت پیچھے رہ گیا۔ بظاہر تو اس کی نمایاں ترین وجہ یہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ ابتدا سے 1977 تک لبرل اور پروگریسو رہا لیکن پھر ''مردِ مومن'' ضیاالحق نے اچانک اسلام کی آڑ میں اپنے اقتدار کو طول دیتے ہوئے پاکستانی معاشرے کو شدید رجعت پسندی، فرقہ وارانہ تقسیم اور عدم برداشت کی ایسی دلدل میں دھکیلا جس میں فلم انڈسٹری بھی دھنستی چلی گئی۔ سخت فلم سنسر کوڈ کے تحت فلموں میں سے رومان اور تفریح کا عنصر کم سے کم کرتے ہوئے تشدد پسندی کی اتنی سرپرستی کی گئی کہ 1980 کے عشرے کی فلموں کے اسی تشدد آمیز پہلو کی وجہ سے ''گنڈاسا کلچر'' کی اصطلاح سے عوام مانوس بھی ہوتے گئے اور لاشعوری طور پر اسے ایک سماجی قدر/ سوشل ویلیو کے طور پر قبول بھی کرتے چلے گئے۔ یوں 1947 سے 1977 تک کسی حد تک بولی ووڈ کا مقابلہ کرنے والی لالی ووڈ کے جسم پر 1977 کے بعد سے کئی نیل پڑتے چلے گئے اور پھر یہ صرف اپنی بقا کی جدوجہد تک محدود ہوتی گئی۔ 1990 سے

افتخار الحق

2025 تک گاہ بگاہ لالی ووڈ باکسنگ رنگ میں ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح ہانپتے ہوئے دوڑتی تو رہی لیکن اس تفریحی میراتھون میں بولی ووڈ کہیں زیادہ آگے نکلتی چلی گئی۔

1988 سے شروع ہونے والے نسبتاً لبرل دور میں بھی لالی ووڈ کو حکومتی سرپرستی برائے نام ہی ملی جب کہ بالی ووڈ کی انڈسٹری اس معاملے میں بہت خوش قسمت رہی۔ امیتابھ بچن جیسے میگا سٹار کی بابت کہا جاتا ہے کہ اندرا گاندھی کے بیٹے راجیو گاندھی سے قریبی مراسم کی وجہ سے بالی ووڈ میں داخلے کا موقع ملا (گو کہ بعد میں سیاسی اختلافات نے ان تعلقات کو مجروح بھی کیا)۔ ہمارے وحید مراد، ندیم، محمد علی اور شاہد کے مقابل دیو آنند، دلیپ کمار، راجیش کھنہ، امیتابھ بچن اور کپور خانوادے کے ہیروز کہیں زیادہ متاثر کن اداکاری کے جوہر دکھاتے رہے اور اس کی ایک وجہ تو بالی ووڈ کی فلموں کا کینوس بین البراعظمی سطح تک پھیلا ہوا تھا اور دوسری وجہ وہاں کی موسیقی، گائیکی اور ریکارڈنگ کا بہتر معیار تھا۔ خیر اب تو شاید ہی لالی ووڈ کسی قسم کا کم بیک/ comeback کر سکے کیونکہ حقیقت پسندانہ اور معروضی مطالعہ و مشاہدہ یہی ثابت کرتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ بہت عمدہ معیار کی فلم کچھ تعلیم یافتہ افراد بنا کر اس بجھتی ہی شمع کو بھڑکانے کی سعی کرتے رہے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ لالی ووڈ کے مقابل پاکستان کی منی سکرین نے 1964 میں اپنے قیام کے ساتھ ہی اپنے پروگراموں کے معیار اور تنوع کے سبب لالی ووڈ اور بھارتی منی سکرین سے بیک وقت مقابلہ کیا اور اپنا لوہا ہر دور میں منوایا۔ طارق عزیز، مشتاق یوسفی، ضیا محی الدین، معین اختر، انور مقصود، مستنصر حسین تارڑ، اورنگ زیب لغاری، قاضی واجد، دلدار پرویز بھٹی کے علاوہ شہناز شیخ، مرینا خان، بیگم خورشید شاہد، عرشِ منیر اور روحی بانو سمیت ایک سے بڑھ کر ایک ایسے فن کاروں کی طویل فہرست ہے جو شاندار کارکردگی، قابلِ رشک تلفظ اور بدیہی جملوں کے امتزاج سے ایک خوب صورت کثیر رنگی کولاژ/ collage سا بناتے چلے گئے۔ یہ کچھ چیدہ بڑے نام ہیں، ورنہ تمام اسما لکھے جائیں تو باقاعدہ انسائیکلو پیڈیا ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ تو ماشاءاللہ ایک ہمہ جہت ادارے اور لیجنڈ کے طور پر ہر دور میں نمایاں رہے ہیں۔

ان کے متوازی متعدد اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہدایت کاروں اور پیش کاروں کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ڈرامہ نگاروں کی بات کی جائے تو اشفاق احمد قدآور ترین نام کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ حسینہ معین، نورالہدیٰ

شاہ، امجد اسلام امجد، انور مقصود، اصغر ندیم سید اور یونس جاوید جیسے بڑے ادیبوں نے شاندار ڈرامے لکھ کر پاکستانی ٹی وی کی اس بظاہر چھوٹے درجے کی صنعت کا لوہا منوایا۔ گاہ بگاہ تو احمد ندیم قاسمی، منٹو اور غلام عباس جیسے بین الاقوامی شہرت کے حامل افسانہ نگاروں کے افسانوں پر مبنی ڈراموں کی سیریز بھی چلائی گئیں۔

اب قابلِ فکر امر یہ ہے کہ ایک ہی دور میں ان دو سکرینوں یعنی سینما اور ٹی وی / منی سکرین کے تفریحی ابلاغ کی کارکردگی میں اتنے واضح تفاوت کی کیا وجہ ہے۔ سب سے پہلا عنصر تو بجٹ کا ہے۔ بڑی سکرین بہت زیادہ بجٹ کی طالب ہے جب کہ ٹی وی ڈراموں کے لیے اتنا زیادہ بجٹ درکار نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں بالی ووڈ باقاعدہ ایک صنعت کا درجہ رکھتی ہے۔ ہندو قوم موروثی طور پر کاروباری صلاحیتوں کی حامل ہونے کے سبب خوش حال تھی، اس لیے اس نئی صنعت میں ہندوؤں نے دل کھول کے سرمایہ کاری کی اور بے پناہ منافع کماتے ہوئے فلم سازی کے حجم میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ اس کے علاوہ ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہندوستان میں اداکاری کی تربیت کے باقاعدہ ادارے بنتے رہے جنھوں نے کئی اداکاروں کی صلاحیتوں کو تسلسل صیقل کیا۔ متحدہ بھارت کے وہ علاقے جو بعد میں پاکستان بنے، ان میں اتفاق سے ایسی تربیت گاہیں نہ بن سکیں۔

1947 کے بعد پاکستانی فلمی صنعت کوئی تین دہائیوں تک کسی نہ کسی طرح بالی ووڈ کا مقابلہ کرتی رہی اور کئی بہت اچھے ادیبوں اور شاعروں نے فلم انڈسٹری کو سہارا دیا۔ فیض، قتیل شفائی، فراز، سیف الدین سیف، تسلیم فاضلی اور مسرور انور جیسے نمایاں شعرا نے شاندار فلمی نغمے بھی لکھے اور ان کی غزلوں وغیرہ کو چوٹی کے گلوکاروں نے مزید شہرت دلوانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ تاہم جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا، حکومتی سرپرستی نہ ہونے، کم سرمایہ کاری اور جدید ٹیکنالوجی کی عدم دستیابی کے سبب سلور سکرین بتدریج سمٹتی چلی گئی اور اس کے برعکس منی سکرین خوب پھیلتی گئی اور پاکستانی ٹی وی ڈرامے بین الاقوامی شہرت پاتے چلے گئے۔ اکیسویں صدی کے آغاز سے نجی ٹی وی چینلز کی ایسی یلغار ہوئی کہ پی ٹی وی گویا اچانک ہی پس منظر میں چلا گیا، گو رسمی طور پر یہ اب بھی فعال ہے۔ پاکستان کے ٹی وی ڈرامہ نگاروں اور اداکاروں میں ایک قسم کا تناسب راست بنتا گیا۔ اس کے نتیجے میں کئی ڈراموں کا معیار متاثر ہوا لیکن مجموعی طور پر ہمارا ٹی وی ڈرامہ بھارت کے مقابلے میں کہیں بہتر کارکردگی کا حامل رہا ہے۔ سال 2026 تک چیدہ نجی چینلز اپنا معیار برقرار رکھنے میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔ اس بابت اہم پہلو یہ ہے کہ مستقبل

میں موضوعات اور پلاٹ کا تنوع پاکستانی ٹی وی ڈرامے کے لیے ایک نہایت اہم عنصر اور چیلنج ثابت ہوگا۔ اس ضمن میں کلاسیکی اور جدید دور کے افسانوں کو ڈرامائی صورت میں ٹی وی سکرین کی زینت بنانے سے بھی یکسانیت کے خطرے سے بچنا ممکن ہوگا۔ عصری منظرنامے میں کئی ڈراموں میں دو انتہاؤں کے طبقات کو دکھایا جاتا ہے اور اکثر نہایت متمول طبقہ ہی ڈرامے کے بیشتر حصے پر چھایا رہتا ہے۔ تاہم کہیں گھریلو سازشیں، کہیں سسرالی مسائل، کہیں ایگری ینگ مین، کہیں عشق کی مثلث اور کہیں محنت تو کہیں شارٹ کٹ کے ذریعے طبقاتی جدوجہد کا شاخسانہ دکھا کر بڑی حد تک تنوع برقرار تو رکھا گیا ہے۔ سائنس فکشن کے موضوع کو شاید ابھی اپنی جگہ بنانے میں کچھ دیر ہے حالانکہ اس میں کامیابی کے قوی جراثیم موجود ہیں۔

ہمارے مصنفین سمیت پوری پروڈکشن ٹیم کو سخت محنت کرتے ہوئے ذہنی دباؤ کی شکار عوام کے لیے صحت مند تفریح کا پیہم سامان کرنا ہوگا۔ ایسا کرنا اس لیے بھی اہم ہے کہ کتب خوانی کے متوازی سکرین بینی کی آڑ میں نوجوان نسل کو بالواسطہ کتب کے مطالعے کی طرف راغب کرنا کافی آسان عمل ہوگا۔ ٹی وی سکرین کے توسط سے ہر دور کے شعرا و ادبا کی تحریروں کی مقبولیت کو برقرار رکھنے کا منفرد طریقہ موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ کئی طویل نظموں کو ڈرامائی شکل میں منی سکرین سے نشر کرنے کی طرف شاید اب تک کسی کا دھیان نہیں گیا۔ ایسی نظموں کو ڈرامے کے قالب میں ڈھالنے کی ایک شکل ٹیبلو تو عرصے سے رائج ہے لیکن اس کا دورانیہ کافی مختصر ہوتا ہے۔ اگر باقاعدہ ڈرامے کی صورت دی جائے تو ایک یا دو قسطوں میں نشر کرنے سے ترسیل و ابلاغ کا عمل کہیں زیادہ مضبوط و موثر بنانا ممکن بھی ہوگا اور دلچسپ بھی۔ یوں ڈرامے اور دیگر اصناف ادب کی گویا ہائبرڈ شکل وجود میں آ کر ادب کے فروغ کی نئی جہات کا تعین کرے گی۔ اس کا ایک اضافی اور بہت اہم فائدہ یہ ہوگا کہ بچوں اور بالغ افراد کو ٹک ٹاک کی یلغار سے بچانا ممکن ہو جائے گا۔ واضح رہے کہ یوٹیوب اور ٹک ٹاک وغیرہ جہاں تفریح کا سامان کرتے ہیں، وہیں ان کے ذریعے ناشائستہ اور غلط تلفظ والی بے ہودہ زبان کو نئی نسل تیزی سے قبول کرتی چلی جا رہی ہے۔ سو ٹی وی کے ذریعے زبان کے اس بگاڑ کو روکنے میں خاطر خواہ مدد ملے گی۔ رفتہ رفتہ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اردو کا فروغ نوجوان نسل میں پاکیزہ اور مہذب پیرایۂ اظہار کو اپنانے کا مقدس مشن ثابت ہوگا۔ اس مشن کے فوری اور دیرپا اثرات سے مثبت ذہنی تربیت کا سامان بہم ہوگا جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆

''خواب کی اذیت میں''

حال ہی میں اردو ادب کے افق پر نمودار ہونے والا سلیم فگار کا تیسرا شعری مجموعہ ہے سلیم فگار کا تعلق جہلم شہر سے ہے وہ گزشتہ دو دہائیوں سے لندن میں مقیم ہیں سلیم فگار کا شمار اپنے عہد کے نمایاں شعرا میں ہوتا ہے جہلم سے ممتاز شاعر اقبال کوثر (مرحوم) کی رفاقت میں اپنے شعری سفر کا آغاز کرنے والے سلیم فگار ''خواب کی اذیت میں'' اپنی شاعری کی معراج پر نظر آتے ہیں مجھے یاد ہے وہ نوے کی دہائی کا زمانہ تھا جب اقبال کوثر (مرحوم) کے علاوہ سلیم فگار، اقبال ناظر، مظہر فکری اور میں باقاعدگی سے ہمدانی ٹی شال (جہلم شہر) میں محفل جمایا کرتے تھے یاران، ادب کی اس محفل کو بزم، اقبال کوثر کہنا زیادہ مناسب رہے گا جہاں شہر کے دیگر شعرا جن میں نصیر کوی مختار جاوید شہزاد قمر یوسف حسن سید انصر امجد میر کے علاوہ کئی اور ادب نواز دوست احباب بھی کبھی کبھار تشریف لے آتے انہی دنوں اقبال کوثر صاحب کی زیر سرپرستی جہلم کی قدیم ادبی تنظیم ''ادارہ ادب افروز'' کی بنیاد رکھی گئی سلیم فگار کو جائنٹ سیکرٹری کی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں

سکندر بیگ مرزا

انھوں نے شہر میں ادبی سرگرمیوں کی ترویج
کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں
اقبال کوثر صاحب کا رویہ اپنے جونیئرز کے
ساتھ انتہائی دوستانہ اور شفقت آمیز ہوتا تھا
وہ ہمیشہ سلیم نگار کو اپنے بیٹوں کی طرح عزیز
رکھتے تھے وہ اس کی نثری نظموں کی دل
کھول کر تعریف کیا کرتے تھے آج سلیم کا
تازہ شعری مجموعہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اقبال
کوثر صاحب جیسے جہاں دیدہ شاعر کتنے
بڑے گوہر شناس بھی تھے انھوں نے اردو
ادب کے میدان میں بیش قیمت ہیرے
تراشے سلیم نگار ان میں سب سے نمایاں
ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی
طبیعت میں شاعری کا عنصر قدرت کی
خوب صورت عطا ہوتا ہے لیکن اس بیج کو
تناور درخت بنانے کے لیے مناسب ماحول
محنت توجہ اور خالص آب و ہوا کی ضرورت
ہوتی ہے اگر لگن سچی ہو تو اللہ کریم خود ہی
ترقی اور تربیت کے راستے بنا دیتا ہے۔
سلیم نگار نے شاعری کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ
کو پورے خلوص لگن اور محنت سے نبھایا ہے
اللہ نے انہیں شاعری کے ساتھ درد کی
دولت سے بھی مالا مال کر رکھا ہے وہ اپنی

خوب صورت شاعرانہ زبان اور قوت، تخیل
کے بل بوتے پر "خواب کی اذیت میں"
حیران کن استعاراتی شعری فضا تشکیل
دینے میں کامیاب ہوئے ہیں ان کی غزلیں
دل کش ردیفوں اور خوب صورت قافیہ پیمائی
کے نادر نمونے ہیں رواں دواں بے عیب
چست مصرعے شاعر کے گہرے فکری
مطالعے تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ ہیں:

نگار اشکوں سے پلکیں سجائی جاتی ہیں
غزل سے پہلے بڑا اہتمام ہوتا ہے

....

رگوں میں شام کے سائے، سرسوں کھلی ہے
چہروں پر، لبوں پہ حیرتیں خیمہ لگائے، رات کی
آنکھیں، دعا کا پیڑ، ہجرتوں کی فصل اور اس
طرح کے لاتعداد خوب صورت استعاروں
اور تشبیہات کی مدد سے شاعر نے ایک
بے مثال خیالی شہر بسا دیا ہے جس کی ہر گلی ہر
موڑ اور ہر منظر دل موہ لینے والا ہے۔
ظلم ناانصافی جبر معاشی ناہمواری اور سرمایہ
دارانہ نظام کی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز
بلند کرنا شاعر کی بنیادی ڈیوٹی ہوتی ہے سلیم
نگار نے بحیثیت شاعر اپنا یہ فریضہ مکمل
دیانت داری اور خلوص سے سرانجام دیا

سلیم فگار کا یہ شعری مجموعہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے شاعر کو خود بھی اپنے کام کی اہمیت کا احساس ہے:

حرفوں سے مرے پھوٹتے روغن کا گماں ہے
لو دیتے جائیں گے دو چار صدی اور

....

لبوں پہ حیرتیں خیمہ لگائے بیٹھی ہیں
تمھارے سامنے باتوں کی تاب ہو تو کہیں

....

مجھے سرگوشیوں میں دھوپ اکثر پوچھتی ہے
دعا کا پیڑ کٹ جائے تمھارا کیا بنے گا

....

پیڑوں کا قتل جرم نہ سمجھا گیا اگر
اک دن چلیں گی آنکھیں شجر ڈھونڈتے ہوئے

....

کہیں پہ لب کہیں آنکھیں بنائی ہیں میں نے
خلا کی لوح پہ شکلیں بنائی ہیں میں نے

....

فضائے جبر نے آواز میری چھینی تو
فصیل ، صبر پہ بیلیں بنائی ہیں میں نے

....

سمندروں نے مرے دشت کا بھرم رکھا
سمٹ کے رہتے ہیں جو بے کنار ہوتے ہوئے

تنہائیوں سے گھر کے ہیں کمرے بھرے ہوئے
ہر سمت ہیں صداؤں کے لاشے پڑے ہوئے

....

تم نے ہماری بات سے آواز کھینچ لی
میں نے بھی بولنے کا تمھیں پھر نہیں کہا

....

دیکھ لے جہلم میرے جہلم
آخر واپس لوٹ آیا ہوں
اتنا تو میں لا نہیں پایا جتنا خود کو کھو آیا ہوں
یاد ہے میرے چہرے پر جو ایک ہنسی تھی
گری کہاں معلوم نہیں ہے
معصومی اور بے فکری کے سارے سکے
اسی کنارے تیری لہریں
ابھرا ابھر کر شور مچا کر گنتی تھیں جو
کہاں یہ مجھ سے خرچ ہوئے ہیں۔۔۔۔

....

208 صفحات پر مشتمل یہ خوب صورت شعری مجموعہ دل کش ٹائٹل اور عمدہ پیپر کے ساتھ الحمد پبلی کیشنز لیک روڈ لاہور نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

استعمار اور محکوم

The Colonizer and the Colonized by Albert Memmi

وقار فیاض صاحب کی ترجمہ کی ہوئی البرٹ میمی کی کتاب ''استعمار اور محکوم'' پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جس ملک ''تیونس'' کا البرٹ میمی رہنے والا تھا اُس کی مختصر تاریخ بیان کی جائے، لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ استعمار کی تعریف بیان کی جائے۔ استعمار سے مراد ایک ملک کا دوسرے ملک کو اپنی عملداری میں لے کر وہاں اپنے اقتدار کو قائم کرنا اور اس کی زمین کو اپنی نوآبادی بنانا ہے۔ یہ ایک سیاسی نظام ہے جس میں ایک طاقتور ملک دوسرے ملک کے معاملات میں جغرافیائی، سیاسی اور اقتصادی طور پر دخل اندازی کرتا ہے اور وہاں کے لوگوں کو اُن کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیتا ہے۔

تیونس اور لیبیا 1911 سے اٹلی کی کالونیاں تھے۔ ان کے مشرق میں واقع مصر برطانیہ کی کالونی تھا جبکہ مغرب میں واقع الجزائر اور مراکش فرانس کی کالونیاں تھے۔

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کا مشہور جرنل رومیل، لیبیا اور تیونس میں جرمن اور اٹلی کی فوجوں کی کمانڈ کر رہا تھا۔ وہ اپنی جنگی چالوں کی وجہ سے مشہور تھا اور ''صحرائی لومڑی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس نے مصر پر قابض برطانوی فوج کو بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچایا تھا۔

اگست 1942 میں برطانوی وزیر اعظم چرچل ماسکو میں روسی صدر سٹالن سے اپنی پہلی ملاقات کے بعد واپس ہوا تو قاہرہ میں ٹھہرا تا کہ شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے حالات کا جائزہ لے۔ اس نے جنرل برناڈ منٹگمری کو مصر میں موجود برطانیہ کی آٹھویں فوج کا کمانڈ بنا دیا۔ اب شمالی افریقہ کی جنگ میں دوسری جنگ عظیم کے دو نامور جرنیل جرمنی کا جنرل رومیل اور

طاہر شبیر

برطانیہ کا جنرل منٹگمری آمنے سامنے تھے۔
جنرل رومیل جارحانہ جنگی حملہ کرنے کے لیے مشہور تھا۔ رومیل مصر پر حملہ کر کے نہر سویز پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ جنرل منٹگمری نے اپنی جنگی چال سے اسے ناکام بنایا۔ برطانوی فوجی چھاؤنی مصر کے شمالی حصے میں واقع تھی۔ جنرل منٹگمری نے مصر کے جنوبی ریگستانی علاقے میں مصنوعی چھاؤنی بنائی جس میں گتے کے ٹینک، توپیں اور طیارے کھڑے کیے گئے اور ان پر پینٹ کر کے بالکل اصلی جیسا بنا دیا۔ جنرل رومیل نے اُسے اصلی چھاؤنی سمجھ کر ٹینکوں اور توپوں سے شدید گولہ باری کی اس کے بہت زیادہ ٹینک ریت میں پھنس کر ناکارہ ہو گئے۔ ہٹلر کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے رومی کو واپس جرمن بلا کر ہسپتال میں داخل کرا دیا تاکہ اس کے دماغ کا علاج کرایا جائے۔
رومیل کی جگہ جرمن فوج کی کمانڈ جنرل فان سٹم کو دی گئی۔ جنرل فان سٹم برطانوی جنرل منٹگمری کے تابڑ توڑ حملوں کا مقابلہ نہ کر سکا وہ اپنی ناکامیوں سے پریشان ہو کر حرکت قلب بند ہونے سے میدان جنگ ہی میں فوت ہو گیا تو ہٹلر نے جنرل رومیل کو 25 اکتوبر 1942 کو لیبیا کے محاذ جنگ پر دوبارہ بھیج دیا۔ ہٹلر نے رومیل کی مدد کے لیے فوج اور اسلحہ بھی بھیجا۔ اب جنرل رومی اس پوزیشن میں تھا کہ وہ برطانوی فوج کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

برطانوی وزیر اعظم چرچل نے امریکی صدر روزویلٹ سے مذاکرات کر کے مدد کی اپیل کی۔ امریکہ نے بڑی فوج اور بھاری اسلحہ اتحادی فوج کی مدد کے لیے بھیجے۔ امریکہ کی اس فوج کی کمانڈ جنرل آئزن ہاور کر رہا تھا جو 1952 سے 1960 تک امریکہ کا صدر رہا۔ اب جنرل رومیل کے مشرق کی طرف مصر میں برطانوی فوج تھی۔ جس کی کمانڈ جنرل آئزن ہاور کر رہا تھا۔ الجزائر میں امریکی فوج کے ساتھ فرانس کی فوج بھی تھی جس کی کمانڈ جنرل ڈیگال کے ہاتھ میں تھی۔ ڈیگال بھی بعد میں فرانس کا صدر بنا۔ 25 اکتوبر 1942 کو برطانیہ اور امریکہ کی دو بڑی فوجیں برطانوی بندرگاہوں سے چلیں ان کی منزل مقصود شمالی افریقہ تھی۔ 8 نومبر 1942 کو تین بجے صبح پانچ سو جنگی جہازوں اور ساڑھے تین سو فوج بردار اور اسلحہ بردار جہازوں کا ایک بڑا بیڑا شمالی افریقہ کے ساحل کی طرف اتحادی فوجی کی امداد کے لیے تھا۔ یہ فوجیں مراکش اور الجزائر میں اُترنے لگیں۔ تین ہفتوں کے اندر اندر ایک لاکھ پچاس ہزار فوجی، بیس ہزار گاڑیاں اور دو لاکھ ٹن رسد مراکش اور الجزائر پہنچا دی گئیں۔
جنوری 1943 میں رومیل نے امریکی فوجوں پر ایک زبردست حملہ کیا۔ اُس نے

اتحادی فوجیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور اتحادی فوج میں افراتفری پھیلا دی۔ اس دوران اتحادی طیاروں نے جرمن فوجوں پر ہزاروں بم گرائے اور اُن کی رفتار کو مدھم ہونے پر مجبور کر دیا۔ امریکی جنرل 'پٹن' اور برطانوی جنرل ایڈرسن شمال اور مغرب سے بڑھے تو جنرل منٹگمری کی آٹھویں فوج نے جنوب مشرق سے پیش قدمی کی۔

منٹگمری کی آٹھویں فوج میں متعدد گروہ مثلاً انگریز، سکاٹ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوجیں، جنوبی افریقہ کے لوگ، ہندوستان کے گورکھے، پولستانی چیک اور فرانسیسی شامل تھے۔ اس نے 23 جنوری 1943 کو لیبیا کے شہر طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ اس فوج کے ساتھ ایک لاکھ سے زیادہ ٹرک مختلف خدمات انجام دے رہے تھے۔

برطانیہ کی آٹھویں فوج جنوری 1943 کے آخر میں جرمنوں کے دفاعی مورچوں پر پہنچی۔ منٹگمری 31 مارچ تک ٹھہرا رہا پھر اُس نے اپنی فوج کے ایک حصے کو حکم دیا کہ دفاعی مورچوں پر براہ راست حملہ کرے۔ دوسرے حصے کو حکم دیا کہ وسیع چکر لگا کر ان مورچوں کے جنوبی بازو سے آگے بڑھے۔ یہ چال بے حد کامیاب رہی۔ رومیل مجبور ہو کر پیچھے ہٹنے لگا لیکن ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی۔ پہاڑوں میں سخت لڑائیاں جاری رہیں۔

اتحادیوں کی مشرقی اور مغربی فوجوں نے جرمنوں کے مقامات پر سخت حملے کیے۔ بعض مقامات بارہا فتح کیے مگر چھوڑنے پڑے۔

7 مئی 1943 کو آخری فیصلہ ہو گیا۔ برطانوی جنرل ایڈرسن کی فوج تیونس میں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی تو جرمن فوجیں دو حصوں میں بٹ گئیں۔ رومیل بچ نکلا۔ جرمن اور اطالوی فوجوں نے ہٹلر کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ ہتھیار ڈال دیے اور اُنھیں گرفتار کر لیا گیا۔ تقریباً اڑھائی لاکھ جنگجو قیدی بنا لیے گئے جس حد تک مسولینی کا تعلق ہے اُس نے عظیم رومی سلطنت کا جو خواب دیکھا تھا وہ ختم ہو گیا۔ یہ ایک تاریخی عجوبہ ہے کہ رومی فوج نے اس مقام پر ہتھیار ڈالے جہاں قدیم قرطاجنہ واقع تھا اور رومیوں نے اسے 146 قبل مسیح میں تباہ کیا تھا۔

تین سال سے بھی کم مدت میں اٹلی نے افریقہ میں تمام نوآبادیاں کھو دیں جن کا رقبہ اٹلی سے دس گنا اور آبادی ڈیڑھ کروڑ تھی۔ تیونس کی جنگ میں مقتولین اور مجروحین کی تعداد ستر ہزار تھی جن میں سے بیس ہزار امریکی تھے۔

20 مئی 1943 کو تیونس کے بازاروں میں فتح کی ایک پریڈ کا انتظام کیا گیا۔

اس طرح کتاب کے مصنف البرٹ میمی کا ملک تیونس جو 1911 میں اٹلی کی کالونی

تھا۔ 20 مئی 1943 کو فرانس کی کالونی بن گیا۔ تیونس اور لیبیا کے مغربی حصے پر فرانسیسی قابض ہو گئے۔ لیبیا کے مشرقی حصے پر برطانوی فوج کا قبضہ ہو گیا۔

تیونس اور الجزائر دونوں ملکوں میں فرانس کی حکومت تھی اس لیے البرٹ میمی کو الجزائر کی یونیورسٹی میں پڑھنے کا موقع ملا۔ البرٹ میمی کی کتاب استعمار اور محکوم کی خاص بات اس میں جین پال سارتر کا تعارفی مضمون ہے۔ جین پال سارتر فرانس کا عظیم رائٹر تھا۔ وہ الجزائر کے عوام کی جنگ آزادی کی حمایت کرتا تھا۔ جب فرانس کے لوگوں نے فرانس کے صدر ڈیگال سے مطالبہ کیا کہ سارتر الجزائر کی تحریکِ آزادی کی حمایت کرتا ہے اس لیے اُسے گرفتار کیا جائے۔ اس پر صدر ڈیگال نے کہا میں سارتر کو کیسے گرفتار کر سکتا ہوں ''سارتر ہی تو فرانس ہے۔''

اسی طرح جب پاکستانی شاعر قیوم نظر نے اپنے فرانس کے دورے کے دوران سارتر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو سارتر نے اُسے ملنے کی اجازت دے دی۔ لیکن جب ملاقات کے دوران سارتر نے قیوم نظر سے پاکستان کے سیاسی حالات کے بارے میں پوچھا تو قیوم نظر نے کہا کہ میں تو شاعر ہوں مجھے سیاست کے بارے میں کیا پتہ۔ اس کے بعد سارتر نے قیوم نظر سے کوئی بات نہیں کی اور قیوم نظر کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس کتاب میں نوآبادیاتی ملکوں میں آباد تین قسم کے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(1) نوآبادکار یا حاکم طبقہ (2 نوآبادی شدہ محکوم طبقہ۔ ان کے علاوہ نوآبادتی تیونس میں ایک تیسرا گروپ بھی تھا، جس میں اٹلی کے باشندے جو پہلے تیونس میں نوآبادکار تھے اور مراعات یافتہ میں شامل تھے لیکن تیونس پر اتحادیوں کے قبضے کے بعد وہ محکوم ہو گئے تھے۔ لیکن ان کا درجہ نوآباد شدہ مسلمان طبقے سے بہتر تھا۔ لیکن وہ مراعات یافتہ نوآبادکار یا حاکم طبقہ کے برابر نہیں تھے۔ وہ اس وجہ سے بھی پریشان رہتے تھے کہ وہ خود کو نوآبادکار یا حاکم طبقے میں شامل کریں جو ان کے اختیار میں نہیں تھا یا نوآباد شدہ (محکوم) طبقے میں شامل کریں، جس کے لیے وہ خود تیار نہیں تھے۔

کتاب کا آغاز ہی نوآبادیاتی عوام کی محرومیاں براہ راست ان مراعات کا نتیجہ ہیں جو نوآبادکاروں کو حاصل ہوتی ہیں۔ تاہم نوآبادیاتی مراعات محض اقتصادی نہیں ہیں اگر نوآبادکار (حاکم طبقہ) اور نوآبادتی عوام کی زندگیوں کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ محکوم عوام روزمرہ کی تذلیل اور ان کی محکومیت میں وہ برتر ہوتا بھی ہے۔ کیونکہ حاکم طبقہ

نوآبادیاتی عوام کو انسانیت کا درجہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔

چھوٹے آبادکار بھی جنھیں بڑے جاگیردار استحصال کا نشانہ بناتے ہیں لیکن وہ پھر بھی الجزائری مسلمانوں کے مقابلے میں خصوصی مراعات کے حامل ہیں کیونکہ ایک عام الجزائری فرانسیسی کی آمدنی ایک عام الجزائری مسلمان سے دس گنا زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں کشیدگی جنم لیتی ہے۔ مسلمانوں کا معیار زندگی مسلسل کم اُجرتوں کیوجہ سے گرتا رہتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے پاکستان میں عدالتوں کے جج صاحبان، اتھارٹیوں اور کارپوریشنوں کے چیف ایگزیکٹو صاحبان اور سینئر عہدوں پر فائز بیوروکریٹس کی تنخواہیں 10 لاکھ روپے ماہوار سے زیادہ ہوتی ہیں۔ جبکہ 20ویں گریڈ کے پی ایچ ڈی پروفیسروں، ڈاکٹروں اور انجینئرز کی تنخواہیں ایک لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ تک ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پاکستانی عوام آج بھی کسی نوآبادی نظام کا حصہ ہیں۔ جس طرح نوآبادی ملکوں میں نوآبادکار یا حاکم طبقے کے نوجوانوں کو سرکاری نوکریاں آسانی سے مل جاتی تھیں اسی طرح پاکستان کے حکمران طبقے یا اشرافیہ کے نوجوانوں کو بھی سرکاری نوکری کم تعلیم اور کم قابلیت کے باوجو آسانی سے مل جاتی ہیں جبکہ مڈل اور لوئر کلاس کے قابل ترین اور اعلیٰ ڈگریاں لینے والے نوجوان ہاتھوں میں ڈگریاں لیے مارے مارے پھرتے ہیں لیکن انھیں سرکاری نوکریاں نہیں ملتیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برطانیہ کی حکومت ختم ہونے کے باوجود برصغیر میں نوآبادیاتی نظام کے اثرات موجود ہیں اور عوام کا استحصال آج بھی جاری ہے۔

نوآبادکاروں یا حاکم طبقے نے نوآبادیاتی ممالک میں فتح تشدد کے ذریعے حاصل کی تھی اور حد سے زیادہ استحصال اور جبر کے تسلسل کے لیے مسلسل تشدد ضروری ہے۔ چنانچہ فاتح فوج ہر وقت تشدد کے لیے تیار رہتی ہے۔

نوآبادکار یا حاکم طبقہ نوآبادیاتی عوام کو جمہوری حقوق دینے سے انکار کرتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام ان انسانوں کے حقوق سے انکار کرتا ہے جنھیں اس نے تشدد کے ذریعے زیرنگیں کیا ہوتا ہے اور انھیں جبر کی تحت بدحالی اور جہالت کی ایسی حالت میں رکھتا ہے جسے مارکس بجا طور پر غیر انسانی حالت قرار دیتا ہے۔

چونکہ مقامی باشندہ ”غیر انسانی“ تصور کیا جاتا ہے اس لیے انسانی حقوق کے اعلامیے کا اطلاق اُس پر نہیں ہوتا اور چونکہ اُس کے کوئی حقوق نہیں ہوتے اس لیے اُسے بے یارومددگار نوآبادیاتی جبر کے ہاتھوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ یہ جبر ہے جو آبادیاتی

نظام کے ساتھ آتا ہے اور نوآبادیاتی طرز عمل سے برقرار رکھا جاتا ہے۔

یہ کتاب کچھ ٹھوس سچائیاں بیان کرتی ہے سب سے پہلی یہ کہ اچھے یا برے نوآبادکار نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی وہ بس نوآبادکار ہوتے ہیں۔ وہ نوآبادیاتی نظام کے تحت چلتے ہیں اور روزانہ عملی طور پر کچھ کرتے ہیں جس کی خالی طور پر مذمت کرتے کیونکہ ان کے تمام اعمال ظلم کے تسلسل میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

ظلم کرنے والے اپنے تشدد سے ان برائیوں کو پیدا کرتے اور برقرار رکھتے ہیں جو محکوموں کو ان کی نظر میں اس حد تک کمزور اور بدتر بناتی ہیں کہ وہ انھیں اپنا مقدر نظر آئیں۔

سارتر نے اپنے مضمون کے آخر میں لکھا ہے:

جب کسی قوم کے پاس صرف یہ اختیار رہ جائے کہ وہ کس طرح مرے گی اور جب کسی قوم کو اس کے جابروں نے صرف مایوسی کا تحفہ دیا ہو تب اس کے پاس کھونے کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ایک قوم کی بدقسمتی اس کا حوصلہ بن جائے گی۔ وہ نوآبادیات کے ہاتھوں مسلسل مسترد کیے جانے کو نوآبادیات کی مکمل نفی میں بدل دے گی۔

مارکس نے ایک بار کہا تھا کہ پرولتاریہ کا راز یہ ہے کہ وہ بورژوا سماج کی تباہی اپنے اندر لیے پھرتا ہے۔

اس کتاب کے آخری باب "نوآبادتی عوام کے دوردعمل" میں البرٹ میمی نے لکھا ہے:

اگر کوئی نوآبادیاتی نظام کو سمجھنے کا فیصلہ کرلے تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ غیر مستحکم ہے اور اس کا توازن مسلسل خطرے میں رہتا ہے۔ انسان ہر حالت سے سمجھوتہ کرسکتا ہے اور نوآبادشدہ (محکوم طبقہ) طویل عرصے تک جینے کی امید میں انتظار کرسکتا ہے۔ لیکن چاہے وہ اپنی حالت کو جلد یا شدید طریقے سے مسترد کرے۔ ایک دن وہ اپنی ناقابل برداشت زندگی کو اپنی پوری دبی ہوئی شخصیت کی طاقت سے الٹنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

آخری میں میری انجمن ترقی مصنفین لاہور کے صدر اور سیکرٹری جنرل سے درخواست ہے کہ رومانوی شاعری، رومانوی افسانوں اور رومانوی ناولوں جن میں شہزادے، شہزادیوں کے عشق کی کہانیاں ہوتی ہیں کے ساتھ ساتھ "استعمار اور محکوم" جیسی کتابوں کی تقریب پزیرائی بھی کراتے رہیں تاکہ عوام کے سیاسی اور سماجی شعور میں اضافہ ہو۔ شکریہ۔

حوالہ جات:

1- جنگ عظیم دوئم، لوکیس ایل سنا مینٹس

2- استعمار اور محکوم۔ البرٹ میمی۔

ترجمہ: وقار فیاض

☆☆☆☆☆☆

اُجلی فکر کا راہنما......جمیل احمد عدیل

اگر آپ ابھی تک جمیل احمد عدیل صاحب کی علمی وادبی نگارشات سے واقف نہیں تو یہ یقینی طور پر آپ کا علمی نقصان ہے۔ جمیل احمد عدیل کا شمار مثبت اقدار زیست کے حامیوں، تعقل پسندوں اور شیوا بیاں اہل قلم میں ہوتا ہے۔ ان کی ہر کتاب مثل آفتاب اور اس کا ہر باب بقعہ علم کی کرن ہے جو اپنی تو بہ تو نکتہ فہمی اور خرد افروزی سے قاری کے قلب ونظر کو منور کرتی ہے__ جو بھی اہل نظر قاری ان کے علمی مضامین، تبصروں اور کالمز سے گزرا وہ ان کی انداز تحریر کا شیدائی ہوگیا۔ کیونکہ ان کا تبصرہ برائے تبصرہ نہیں ہوتا کہ بس پڑھا اور آگے بڑھ گئے۔ بل کہ عدیل صاحب اپنے مطالعاتی وسعت سے موضوع کو عام سطح سے بلند ہو کر پرکھتے اور اس پر اس منفرد انداز سے اظہار کرتے ہیں کہ اس کے فیض سے قاری بھی خود کو آگہی کے اگلے زینے پر محسوس کرتا ہے__ ان کی کتب ''قیل وقال'' اور ''فتاویٰ کاشمیری'' سے میں نے محسوس کیا کہ آج تک میں جس افسانہ نگار، شاعر اور نقاد جمیل احمد عدیل کو خالص ادبی نگارشات کے حوالے سے جانتا تھا، ان دو کتب، خاص طور پر ''قیل وقال'' کے بعد ان کے ادبی قد کاٹھ کے ساتھ ساتھ شخصی روپ سروپ بھی میرے ذہن میں یکدم کچھ بدل سا گیا ہے (بجا طور پر ارفعیت کی طرف)۔

اعجاز روشن

اس بدلی ہوئی تقدیسی روش کو میں نے کچھ عرصے پہلے ان کی تصنیف ''تفرید'' میں محسوس کیا تو تھا لیکن اسے ایک ادیب اور نقاد کا محض ''منہ کا ذائقہ'' بدلنے کی وقتی کوشش ہی سمجھا تھا لیکن آج ان دونوں قیمتی کتب ''قیل و قال'' اور ''فتاویٰ کالمگیری'' سے پتہ چلا، اور نہایت خوشگواریت کے ساتھ، کہ بات خاصی بڑھ گئی ہے، اب جمیل احمد عدیل صاحب کی علمی وسعت کے اتنے رخ بن گئے ہیں جنھیں بیک مجموعی ایک نشست، ایک محفل یا ایک کتاب کے اندر گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔ کہنے کو یہ کالم ہیں لیکن اپنی اصل میں بڑے عالم ہیں اور اپنی طرف کھینچنے کی بھرپور مقناطیسی علمی کشش رکھتے ہیں۔ میں ہمیشہ ہی اخباری سیاسی کالموں سے کتراتا رہا ہوں شاید یہ دو کتب اسی پرہیزگاری کے اجر کے طور پر مجھے ملی ہیں۔ جمیل احمد عدیل ایسے باشعور قلم کار ہیں جو وقت کے تقاضے سمجھتے ہیں اور اس بنیاد پر ان کی تحاریر میں ایک دل دردمندی واضح پکارسنائی دیتی ہے جو اپنی ہم عصر زندگی کے تقاضوں اور ادراک کے حصول کا سفر طے کرتی ہیں اور ایک گلوبل ولیج Global Village کے اندر اہل قلم کو ان کی ذمہ داریوں کا دھیمے لہجے اور شگفتہ انداز سے احساس دلاتے ہیں۔ عدیل صاحب کی یہ دونوں کتابیں اہل قلم کو اس گلوبل ولیج کے اندر نمایاں ہونے والی زندگی اس کی حسیت، اقدار اور رویوں کی طرف توجہ دلاتے اور یہ باور کراتے ہیں کہ اب انھیں فکری طور پر ایک نوع کی عالم گیریت کا سامنا ہے جہاں انھیں مشرقی اور تہذیبی اقدار کو محض بچانا ہی نہیں بل کہ انھیں اس ڈھنگ سے ہم عصر بنانا ہے کہ وہ دقیانوسی بھی نہ رہیں اور نئے عہد کے ہاتھوں آزادی کو اپنائیں جو بے مہار ہو کر معاشرے کا چہرہ ہی بگاڑ ڈالیں۔ اس کے لیے ان کی اکثر تحریروں سے دینی اشارے ملتے ہیں گویا ادب اور فن کے ساتھ وہ سماجی مسائل اور ان کے حل کے لیے دین کے موید بھی ہیں۔ آزادی اور جمہوریت انسانی ضمیر کی روشنی اور حسن ہیں۔ لیکن یہ اجلا پن محض سیاسی نعرے اور شعور سے روشن معاشرے کی تشکیل کا باعث نہیں بن سکتا جب تک کہ ان کے اندر احکام خداوندی اور ان سے جڑی انسانی قدروں کو خیر کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے۔ فلاح اور محبت کا یہی پیغام عدیل صاحب کی ان روشن فکر کتابوں

کا مطمع نظر ہے۔ جو وجود اور روح کو امید بھری طمانیت کے ساتھ الفاظ کی پاکیزگی کا اعتبار بھی عطا کرتا ہے۔

شگفتگی اور سنجیدگی ان کے ہر مضمون کا نمایاں وصف ہے۔ جس کی ایک عمدہ مثال ان کا مضمون ''علت اور معلول کا رازوں بھرا نظام'' ہے۔ پھر قدرت اللہ شہاب کے ''شہاب نامہ'' کو تجزیے کی باریک چکی سے پیس کر حاصل جمع سے چھان بورا الگ کر دکھایا ہے۔ اور دلائل کے چھینٹے لگا کر خوب روٹی پکائی ہے کہ جسے ہضم کرنے کے لیے علم اور بصیرت کی اعلیٰ کوالٹی کی پھکی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہاں سے ایک اقتباس دیکھتے ہیں:

''کسی خاص شعبے میں ، اس کے تمام تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس شعبے کا کامیاب فرد بن جانے کے بعد اس کے بالکل متضاد شعبہ سے متعلق بعض اعمال و افعال کر کے کچھ لوگوں نے اپنی شخصیت کو اس طرح ابھارا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شہرت کے بام عروج پر پہنچ گئے۔ یہ ایک خالصتاً نفسیاتی طریق کار (بلکہ واردات) ہے جس کا بہت زیادہ تعلق انسانی ذہن کی دراکی سے ہے۔ جیسے کوئی روایتی مذہبی رہنما بلکہ مولوی اپنی تقریر میں جدید سائنس ، کاسموگرافی ، اور پیراسائیکولوجی وغیرہ کے حوالے دینے شروع کر دے تو کم پڑھے لکھے سننے والے چونک جاتے ہیں۔ شہاب صاحب کا معاملہ بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہے لیکن عمل کے حوالے سے معکوس ہے''۔

ان بیش بہا قیمتی کتب کو پا کر میری سرشاری کا عالم یہ ہے کہ سرعت کے ساتھ ان کے مطالعے سے گزرنا چاہتا ہوں اگرچہ جانتا ہوں کہ مطالعہ کا یہ قرینہ فائدہ مند نہیں ہو گا۔ میں انھیں جرعہ جرعہ پڑھوں گا اور عدیل صاحب کو دعائیں دوں گا کہ ان کی یہ کتب میرے لیے مقدس روشنی کا وسیلہ ہیں۔ مقدس اس لیے کہا کہ کتابوں کے بیشتر کالم دینی موضوعات پر مشتمل ہیں، لیکن نہ اس طرح کے مذہبی کہ ان پر اسلاموفوبیا کا لیبل لگایا جائے۔ جنھیں پڑھتے وقت مذہب اور دین میں ما بہ الامتیاز ملحوظ رکھا جائے تو بات واضح ہو گی اور یہ خالصتاً علمی مضامین / کالم اپنا آپ کھولیں گے۔

یہاں پھر ایک چھوٹا سا اقتباس دیکھتے چلیے:

''جب جمالیات پر مالیات کا غلبہ ہو جائے تو اس سوسائٹی میں چیزیں حاکم بن جاتی ہیں اور اس کے خالق محکوم ___ پھر ان چیزوں کے حصول کی خاطر رشتے قربان

ہوتے ہیں، افراد قتل ہوتے ہیں، انسان کچلے جاتے ہیں اور یوں ظلم کی حدود توسیع پسندی کے ناقابل علاج عارضے میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ فرد کے اندر کا بش یعنی شر کی قوتیں مجتمع ہو کر انسانوں کی تباہی پر تل جاتی ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بستیاں اجڑنے لگتی ہیں، ویرانے وجود پذیر ہونے لگتے ہیں اور کھنڈرات کے بیچوں بیچ فتح کے پھریرے لہرانے لگتے ہیں، جو شر کی عظمتوں کے ترانے الاپ الاپ کر دنیا پر یہ ثابت کرتے ہیں دیکھا ہماری قوتوں کا اظہار اے لوگو دیکھو یہ ہم ہیں اور یہ ہیں ہماری طاقتیں، ہے کسی میں مجال جو ہمارے روبرو اپنی نگاہ بلند کر سکے جب ہر طرف باقی ماندہ سر جھکے ہوتے ہیں تو اس ظلم کا نفس وہ تسکین پاتا ہے جس کا کہیں نعم البدل نہیں''۔

میں سوچتا ہوں کہ جس طرح شاعری کے اندر اظہار کی تنگنائی کا ذکر کیا جاتا ہے اور لوگ ناول اور افسانے کا رخ کرتے ہیں، ممکن ہے افسانے میں بھی یہی مسئلہ پیدا ہوتا ہو۔ کیوں کہ تخلیقی اعتبار سے تو جمیل احمد عدیل کا پہلا حوالہ افسانہ نگاری ہے، اور دوسرا انتقادکا۔ ممکن کہ افسانے کی تنگنائی سے نکل کر عدیل صاحب نے کالم کا رخ کیا ہو، گمان تو یہی ہے۔ کیونکہ جس طرز کے افسانے انھوں نے لکھے ہیں وہ ہر روز لکھے جانے والا افسانہ بھی نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ایک ہمہ وقت اور ہمہ جہت صاحب مطالعہ اور لکھنے والی شخصیت اپنے علمی وفور کے دوران افسانے کے انتظار میں، گوشہ گیر اور بالکل خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ لہٰذا عدیل صاحب کا یہی علمی وفور ان کالمز کے اندر حشر ساماں انداز سے جلوہ نما ہو کر الفاظ، تخیلات اور علم و فکر کے نئے روشن نشاں، بہت بے لوث ہو کر، بناتا چلا جاتا ہے۔

فکری اور تہذیبی ہونے کے ساتھ یہ ادب ہی کی کتاب ہے، اور ادب کا بنیادی موضوع انسان ہی ہے، اور اس کے اچھے برے اعمال کے صلے میں تشکیل پاتے اچھے برے معاشرے کی باتیں ہیں جن کا اظہار جمالیاتی تقاضوں اور ادبی معیارات کے مطابق اور زندگی آموز اور زندگی آمیز ہے۔ اکثر تحریروں میں ادب اور نظریے کا تضاد بھی نئی معنویت کے ساتھ سامنے آتا ہے، عہد کے اس تضاد، نظریے اور ان کے فہم پر کلیم الدین احمد نے کہیں لکھا ہے کہ:

''شاعر اپنے عہد میں ادراک کے بلند مقام

پڑھتا ہے۔ وہ بلبل کی طرح عالم بے اختیاری میں گاتا نہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے سوچ سمجھ کر کہتا ہے، میں اس وقت آرٹ اور تحت الشعور کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آرٹسٹ جو کچھ کرتا ہے شعوری طور پر کرتا ہے، اور فنی کارنامہ ایک شعوری عمل ہے''۔

اس رائے کی روشنی میں جمیل احمد عدیل کا ہر مضمون ایک بھرپور شعوری عمل، پُراُمید، اور نیک طینت ثابت ہوتا ہے۔ جمیل احمد عدیل نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقائق کو جانا ہے اور اس سے حاصل ہونے والے تجربات اور ان سے پیدا ہونے والے احساسات اور خیالات کا فن کارانہ اظہار کیا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ادب کی عمارت فکر و احساس اور حسن و صداقت کی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے۔ ہر چند کہ سماج میں پائے جانے والی بدصورتیوں اور اندھیروں سے صرف نگاہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن فنی معراج کی پاسداری کے ملحوظ رکھے جانے کا مکمل احساس بھی عدیل صاحب کے خوبصورت کالموں کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔ آل احمد سرور کا ایک بامعنی قول ہے کہ:

''ادب میں نظریے کی وہی اہمیت ہے جو زندگی میں نظر کی ہے۔ ادب فکر و فن دونوں کا مجموعہ ہے''۔

اور جمیل احمد عدیل کی تصنیف ''قیل وقال'' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لیکن علم و فکر کے نرغے میں پڑ کر عدیل صاحب نے فلسفیانہ تھیوریز کا رعب بھی نہیں ڈالا، اگرچہ وہ ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن وہ عوام اور قارئین کے دل و ذہن میں سہل انگاری کے ساتھ اترنے کا گُر جانتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا:

''نقاد کا بنیادی کام تفہیم اور درجہ بندی کے بعد لوگوں کو آسان پیرائے میں سمجھانا اور پیچیدگیوں کو سلجھانا ہے لیکن ہمارے یہاں عوام عام طور پر ایسا نہیں کیا جاتا''۔

یوں یہ دونوں کتابیں ''قیل وقال'' اور ''فتویٰ کاشگیری'' صرف کالم نہیں ہیں بلکہ نئی ادبی تنقید کے رجحانات کو بھی اپنے احاطے میں لاتی ہیں اور اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ یہ کتابیں ادب کے ہر طالب علم کے ساتھ ہر استاد کے لیے بھی مفید ہیں، اور یہ خوب صورت کتابیں لازماً ان کی لائبریری میں ہونی چاہئیں۔

☆☆☆☆☆

گورنمنٹ کالج، مادرِ علمی یا درگاہ

یہ حقیقت ہے کہ زندگی میں آپ جن لوگوں سے ملتے ہیں، جن جگہوں پر وقت گزارتے ہیں ان کے اثرات زندگی بھر آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس طرح میرا جو وقت گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور اور نذیر احمد موسیقی انجمن میں گزرا۔ اس کے اثرات ہمیشہ میری زندگی پر باقی رہیں گے۔ میرا تعلق لاہور کے ایک متوسط گھرانے سے ہے جہاں وسائل اور ترقی کے مواقع نسبتاً کم ہیں۔ انہی کم وسائل کے ساتھ آنکھوں میں مستقبل کے خواب سجائے 2018 میں ایف اے میں میرا داخلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہو گیا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ میرے لیے اتفاقی امر تھا۔ میں مولا محمدؐ و آلِ محمدؐ کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرے والد کی خواہش کو پورا کیا۔ ایف اے کرنے کے بعد میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے ہی گریجوایشن کر چکا ہوں اور مجھے اس ادارے میں چھے برس بیت گئے ہیں۔ یہ چھے برس کیسے بیت گئے علم نہ ہو سکا۔ میں جب بھی گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے باہر سے گزرتا ہوں تو اس کے اونچے برج کو دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے سلامی پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ ادارہ میری پہچان اور عزت کی وجہ بنا۔

میں جب جب گورنمنٹ کالج کے پاس سے گزرتا ہوں مجھے تب تب جناب اشفاق احمد کی بات یاد آتی ہے کہ ”ہم آگے کو جا رہے تھے اور گورنمنٹ کالج پیچھے کو ہٹتا جا رہا تھا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔“

میرا یہ ماننا ہے کہ کچھ در و دیوار ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے بغیر زندگی نا راض محسوس ہوتی ہے۔ بالکل ایسا ہی کچھ رشتہ میرا گورنمنٹ کالج لاہور سے ہے۔ یہ ادارہ بہت سے لوگوں کی محبتوں کا محور ہے۔ خوب صورتی کی بات کی جائے تو جو دھوپ یہاں نکلتی ہے وہ صرف یہیں نکلتی ہے۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کی خوب صورتی کو بیان کرنا آسان بات نہیں۔ بالخصوص وقتِ شام جب ڈھلتے سورج کی کپکپاتی کرنیں کالج کی ہلکی بھوری سرخ عمارت پر اپنا سنہرا رنگ بکھیرتی ہیں تو ماحول پر ایسا سحر طاری ہوتا ہے کہ نظریں گرد و نواح میں واقع تمام اہم عمارتوں کو نظر انداز کر کے بس اسی میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ بجا کہوں تو یہ نظارہ مکمل طور پر ناقابلِ بیان ہے۔ شاید قدرت نے اس منظر کو بیان کرنے والی زبان پیدا ہی نہیں کی، اگر کی ہوتی تو قوی امکان تھا کہ تمام ادبا، شعرا محبوب کی زلفوں، غمِ ہجر اور ڈالیوں کے حُسن سے نکل کر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے لیل و نہار کی جمالیات کو بیان کرنے

بلال اکمل قریشی

میں زندگیاں صرف کر دیتے۔

جس بھی فن کار کا شہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمھیں سوچا ہوگا

....

جب میں نے پہلی مرتبہ گورنمنٹ کالج میں قدم رکھا تھا تو ایک سیدھا راستہ جو مرکزی عمارت کی طرف جاتا ہے دائیں اور بائیں اطراف میں موجود درختوں سے گرنے والے پیلے اور نارنجی پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پرندوں کی چرخ چرخ سنائی دے رہی تھی۔ وہ آوازیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ وہ چرخ چرخ آج بھی میرے دماغ میں وہ موسیقی پیدا کرتی ہے کہ جس کے سامنے ساری دنیا کے تمام ستار جھکتے ہیں۔ دورانِ خلوت اگر دل میں جھانک کر اس موسیقی کو سنا جائے تو حسین یادوں کا سیلاب اُمنڈ آتا ہے۔ میرا ادارہ محض ادارہ نہیں بل کہ وہ شجرِ سایہ دار ہے کہ جس کی چھاؤں میں رکھے علمی مٹکوں سے دور دراز سے آئے باصلاحیت طلبا اپنی ادبی و فنی پیاس بجھاتے ہیں۔ یہ صرف ادارہ ہی نہیں بل کہ افکار کا وہ آفتاب ہے کہ جس کی روشن کرنیں ہر وقت دل کی بند گرہوں کو کھولنے میں سرگرم ہیں۔ یہ وہ بحرِ بیکراں ہیں کہ جس نے آوارہ ڈولتی ہوئی کشتیوں کو سہارا دے کر جانبِ منزل رواں کیا۔

لفظ سے معنی تک کا سفر طے کرنے کا جو ہنر مجھے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور نے عطا کیا ہے یہ میری زندگی کا قیمتی ترین اثاثہ ہے۔ آج چھ برس بیت جانے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بہت قیمتی چیز گنوا دی میں نے۔ کاش وہ وقت رک جاتا کہ میں اب بھی اس علم پرور ماحول کا حصہ ہوتا اور استاد جی (سر ڈاکٹر محمد سعید) کے ساتھ محوِ گفتگو رہتا اور ان کی گفتگو سے اپنی فکر کو مزین کرتا، مگر شاید اسی کو تغیر کہتے ہیں۔ اس دنیا میں کسی کو ثبات حاصل نہیں۔ کاش وہ وقت تھم جاتا جب میں اور میرا بھائی عبداللہ ظفر اپنے اس ادارے میں گھوما پھرا کرتے تھے۔ کاش وہ وقت رک جاتا جب میں اور عبداللہ روز صبح اپنے ادارے میں داخل ہوا کرتے اور قہقہے لگاتے کلاسوں کی طرف جایا کرتے تھے۔ میری زندگی کا کوئی ایسا موضوع نہیں کہ جس پر ہم محوِ گفتگو نہ ہوئے ہوں۔ بجا کہوں تو میری زندگی میں ایسا کوئی سفر ہی نہیں جو میں نے عبداللہ کے بغیر طے کیا ہو۔ کاش وہ وقت رک جاتا جب ہم روز شام کو موٹر سائیکل پر افراہیم بھائی کی طرف جایا کرتے تھے۔ افراہیم کا شمار میرے اُن دوستوں میں ہوتا ہے جو ہمیشہ میرے ساتھ رہے جنھوں نے مجھے ہر معاملے میں تقویت بخشی اور مجھے ثابت قدم رکھا۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے اس چار سالہ عرصے میں کوئی ایسا پرچہ نہیں، کوئی ایسا لیکچر نہیں جو ہم نے الگ بیٹھ کر لیا ہو۔ افراہیم شاد کا آسان تعارف تو یہ کہ ہم دونوں کے پرچوں میں نام کے علاوہ کبھی کچھ تبدیلی نہ ہوئی۔ دل پھٹ رہا ہے یہ سوچ کر کہ جن لوگوں کو دیکھے اور سنے بغیر دن نہیں گزرتا تھا اب نہ جانے ان سے کب ملاقات ہو پائے گی۔ میرے لیے اوول گراؤنڈ کا ایک ایک بینچ یادگار ہے بالخصوص وہ بینچ کہ جس کی

جڑ اب مصنوعی جنگل اُگا دیا گیا ہے۔ مجھے وہ وقت ہمیشہ یاد رہے گا جب میں، فاطمہ بتول، کنزیٰ شفیق اور عبداللہ ظفر وہاں بیٹھا کرتے تھے۔ کیا ہی وہ خوبصورت وقت تھا جب شام کے سائے پھیلنے لگتے اور دل کے آنگن کی اداس کلیاں اچانک مہک جایا کرتی تھیں اور جسم میں اضطراب کی ایک اجنبی سی لہر دوڑ اُٹھتی۔ اس کیفیت کا نام دریافت کرنے میں اب تک کی تمام لسانیات نامراد ٹھہری ہے کہ آخر اس محبت کے احساس کو کیا نام دیا جا۔ میں نے اس ادارے میں رہ کر بہت کچھ سیکھا۔ مجھے اس ادارے کی بدولت بہت سے قیمتی احباب نصیب ہوئے جن کے ساتھ نے مجھے بہت تقویت بخشی۔ جن کی بدولت میں نے وقت کو ایسے لمحات میں قید کیا جو ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے۔ یہ بات درست ہے کہ لوگ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے نکل جاتے ہیں مگر لوگوں کے دلوں سے گورنمنٹ کالج نہیں نکلتا۔ یہ ادارہ میرے لیے بہت سے وعدوں کی یاد ہے، جنھیں میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی زندگی میں اس ادارے کی افادیت کو نہیں جھٹلا پاؤں گا، کیونکہ مجھے اس ادارے کی بدولت سر طارق سلمان خان فرانی، جعفر حسین، ملک متین اکمل صاحب، پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی صاحب، پروفیسر ڈاکٹر صائمہ ارم صاحبہ، ڈاکٹر محمد سعید صاحب، ڈاکٹر سیدہ مصباح رضوی صاحبہ، ڈاکٹر صغیر حیدر صاحب، محمد صدیق اعوان صاحب جیسے شفیق اساتذہ کی صحبت نصیب ہوئی۔ یہ وہ صحبت تھی کہ جس کی بدولت میں نے خود کو تراشا۔ بجا کہوں تو گورنمنٹ کالج ایسی درگاہ ہے جس میں وہ تاثیر موجود ہے جو کسی کو فراموش نہیں ہونے دیتی۔

یہاں میں ایک واقعے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تقسیمِ ہند کے بعد ممتاز قلم شار اور لکھاری دیو آنند صاحب کو جب اپنے مادرِ علمی، گورنمنٹ کالج لاہور آنے کا موقع ملا تو عالم کچھ یہ تھا کہ وہ بے ساختہ دیواریں چومتے جاتے تھے اور فرطِ جذبات میں روتے جاتے تھے۔ یہی وہ تاثیر اور سکون ہے جو ہمیں برگزیدہ بزرگوں کی درگاہوں پر محسوس ہوتا ہے۔ یہی اصل وجہ اور فرق ہے جو گورنمنٹ کالج (مادرِ علمی، درگاہ) کو دوسرے اداروں سے ممتاز کرتا ہے۔

رنگ نکھرتا رہتا تھا
اور خوشبو پھیلتی رہتی تھی
جھونکا جھونکا عنبر عنبر
کوچہ کوچہ جنت تھا
بحر بحر میں خوشیوں کی صد
موجیں اُٹھتی رہتی تھی
نور کی بارش ہوتی تھی
اور آس کی کلیاں کھلتی تھیں
شاخ شاخ پہ پات ہرے تھے
باغ باغ میں غنچے بھرے تھے
اس خوشحال نگر میں اب کے
سونی سونی گلیاں ہیں اور
کالی کالی راتیں ہیں

☆☆☆☆☆

فیلِ جدید اور ابابیلِ وقت کی پکار: یونس خیال کی نظم کا تجزیاتی مطالعہ

کچی فصلوں کے کٹنے پر نوحہ

ربِ کعبہ!
ہاتھی والے
بم، راکٹ، بندوق اُٹھائے
اپنے سر پہ
انسانوں کی عظمت والے
کتبے رکھے
کچی فصلیں کاٹ رہے ہیں
پکی فصلیں روند رہے ہیں

ننھے پودوں کے ہونٹوں میں
سلوٹ سلوٹ
خون جما ہے، پیاس بسی ہے
ہر اک رگ میں
درد کی شدت جاگ رہی ہے
لیکن ان میں خوف نہیں ہے
تیری جانب دیکھ رہے ہیں

ربِ کعبہ!
اب کے تیرے دوسرے گھر میں
کالے اور مٹیالے ہاتھی
بھوری آنکھوں والے ہاتھی
انسانوں کو روند رہے ہیں

ہاتھی والے
ناچ رہے ہیں
جھوم رہے ہیں
ساری دنیا ان کے آگے
سہمی اور مجبور کھڑی ہے

کعبہ والے!
پھر سے کوئی
بھیج ابابیلوں کا لشکر!!

ڈاکٹر یونس خیال دبستانِ سرگودھا سے

نجمہ منصور

وابستہ ایک جدید نظم نگار ہیں انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی شام دوستاں میں سانس لیے ان کی ادبی شخصیت کی تراش خراش میں ان محافل کا حسن اور بے ساختہ پن موجود ہے۔ یونس خیال کی یہ نظم ''کچی فصلوں کے کٹنے پر نوحہ'' محض چند مصرعوں کا مجموعہ نہیں بل کہ عصرِ حاضر کے کرب، انسانیت کی تذلیل اور ظلم و استبداد کے خلاف ایک ہمہ گیر جذباتی اور فکری دستاویز ہے۔ شاعر نے اس نظم میں علامتی پیرائے اور قرآنی تلمیحات کے ذریعے ایک ایسا کینوس تخلیق کیا ہے جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر ہر اس خطے کی کہانی سناتا ہے جہاں بارود کی بو نے معصوم کلیوں کی مہک کو غصب کر لیا ہے۔

نظم کا آغاز ''رب کعبہ'' کی پکار سے ہوتا ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ جب زمین کے خداؤں کا ظلم حد سے بڑھ جائے اور انسانیت سسکنے لگے تو مظلوم کی آخری پناہ گاہ وہی ذات ہوتی ہے جو کعبہ کی رب ہے۔ شاعر نے یہاں تاریخی تسلسل کو جوڑنے کے لیے ''ہاتھی والوں'' کی علامت استعمال کی ہے جو براہِ راست سورہ الفیل کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح ابرہہ اپنے لشکر اور ہاتھیوں کے زعم میں کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا، بالکل اسی طرح آج کے ''ہاتھی والے'' اپنے ٹینکوں، بموں اور راکٹوں کے ساتھ انسانیت کے احترام کو پامال کر رہے ہیں۔ قرآنی تعلیمات ہمیں بتاتی ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے باطل کے اس غرور کو ''عصف ماکول'' (کھائے ہوئے بھوسے) کی مانند کر دیا تھا۔ یونس خیال اسی تاریخی سچائی کو آج کے تناظر میں پکارتے ہیں کہ جب مادی طاقتیں انسانوں کی عظمت والے کتبے اپنے پیروں تلے روند رہی ہوں تو پھر سے اسی خدائی مداخلت کی ضرورت ہے۔

شاعر نے ''کچی فصلوں'' اور ''ننھے پودوں'' کے استعارے سے ان معصوم بچوں کی تصویر کشی کی ہے جن کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ ایک غاصب قوت کے سامنے آنکھیں کھولتے ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر جمی خون کی سلوٹیں اور رگوں میں جاگتی درد کی شدت اس سفاکی کا نوحہ ہے جسے دنیا خاموشی سے دیکھ رہی ہے۔ یہاں ایک اہم نکتہ ان بچوں کی ''استقامت'' ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' نظم میں یہ ذکر ''ان میں خوف نہیں ہے'' اور وہ ''تیری جانب دیکھ رہے

ہیں''۔ اس ایمانی قوت کو ظاہر کرتا ہے جو مادی ہتھیاروں سے نہیں چھینی جا سکتی۔ یہ ان لوگوں کی عکاسی ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے خالق پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

نظم کا دوسرا حصہ موجودہ عالمی بے حسی پر ایک گہرا طنز ہے۔ ''کالے، نیلے اور بھوری آنکھوں والے ہاتھی'' کی اصطلاحات سے شاعر نے ان سامراجی اور استعماری قوتوں کی نشاندہی کی ہے جنھوں نے جدید اسلحے کے زور پر دنیا کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ جب شاعر کہتا ہے کہ ''ساری دنیا ان کے آگے بے بس اور مجبور کھڑی ہے'' تو یہ اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کے نام نہاد علمبرداروں کی اس بے بسی کا نوحہ بن جاتا ہے جو ظلم کو دیکھتے ہوئے بھی مصلحتوں کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ یہ صورتحال قرآنی اصول ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کی نفی ہے، جہاں برائی کو روکنے کے لیے ہاتھ اور زبان کا استعمال ناگزیر ہے، مگر یہاں دنیا خاموش تماشائی بنی ناچتے ہوئے ظالموں کو دیکھ رہی ہے۔

فنی اعتبار سے یونس خیال نے دبستانِ سرگودھا کی اس روایت کو برقرار رکھا ہے جہاں جدید ہیت اور کلاسیکی گہرائی کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کا لہجہ فریادی بھی ہے اور انقلابی بھی۔ نظم میں ''ابابیلوں کے لشکر'' کی طلب محض ایک دعا نہیں بلکہ ایک تڑپ ہے کہ حق و باطل کے اس معرکے میں غیب سے نصرت آئے۔ قرآن کی رو سے اللہ کی سنت یہی ہے کہ وہ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے مگر جب اس کی پکڑ آتی ہے تو وہ نہایت سخت ہوتی ہے۔ شاعر کا یہ نوحہ اسی یقینِ کامل پر ختم ہوتا ہے کہ تاریخ خود کو دہرائے گی اور کعبہ کا رب پھر سے کسی ابابیل صفت گروہ کو مبعوث کرے گا جو ان ہاتھی والوں کے غرور کو خاک میں ملا دے گا۔

مجموعی طور پر یہ نظم غزہ ہو یا کشمیر، یا دنیا کا کوئی بھی مظلوم خطہ، وہاں بہنے والے لہو کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ انسانی جان کی حرمت کعبہ کی حرمت سے زیادہ ہے اور جب ''کچی فصلیں'' بے دردی سے کاٹی جانے لگیں تو ربِ کعبہ کی عدالت میں دستِ سوال دراز کرنا ہی اہلِ صفا کا شیوہ ہوتا ہے۔ یونس خیال نے اپنے مشاہدے اور قلبی واردات کو جس ہنرمندی سے نظم کیا ہے وہ قاری کے اندر نہ صرف کرب پیدا کرتا ہے بلکہ اسے ظلم کے خلاف فکری طور پر بیدار بھی کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

دو اشعار ایک شارح

(شاعر: نثار ترابی شارح: طارق حنیف)

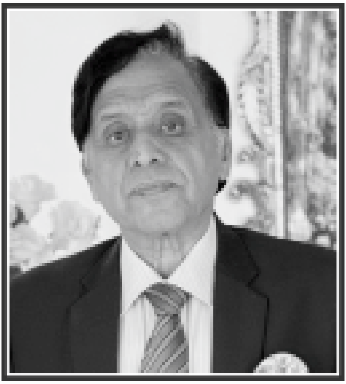

نثار ترابی ادبی حلقوں میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔انھوں نے بیک وقت تخلیقی،تنقیدی اور تحقیقی سطح پر قابل تحسین کام کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کی متعدد کتب علمی و ادبی حلقوں سے داد و تحسین سمیٹ چکی ہیں۔ان کی پنجابی شاعری کا مجموعہ ”اپنی چھاں واسیک“ اور اردو شاعری کے مجموعے ”ہر صدا مسافر ہے“،”بارات گلابوں کی“ اور حال ہی میں شائع ہونے والا مجموعہ ”خوشبو آواز دیتی ہے“ ان کے فکری و فنی سفر کے مختلف پڑاو ہیں جو ان کی فکری بلندی اور فنی پختگی کی روشن گواہی ہیں۔یہاں ان کے شعری مجموعے ”ہر صدا مسافر ہے“ سے دو منتخب اشعار کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے:

ہر عقیدت کی ایک منزل ہے
ہر جبیں آستاں تلاش کرے
نثار ترابی

دنیا میں جو بھی عقیدت یا لگاؤ پایا جاتا ہے، اس کا ایک ٹھکانہ ہوتا ہے۔عقیدت خواہ کسی شخصیت سے ہو، کسی نظریے سے ہو یا کسی مقصد سے، وہ بے سمت نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک منزل تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔

انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اپنی عقیدت اور سجدے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈے۔انسان جب کسی سے متاثر ہوتا ہے یا کسی پر یقین رکھتا ہے تو اس کا دل چاہتا

طارق حنیف

ہے کہ وہ اس کے سامنے اپنی عاجزی اور احترام کا اظہار کرے۔ اس طرح ہر انسان کی پیشانی اس جگہ کو ڈھونڈتی ہے جہاں وہ جھک کر اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کر سکے۔ اقبال نے یونہی نہیں کہہ دیا تھا:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

....

سجدہ انسان کی جبیں میں رکھ دیا گیا ہے اور اسے اب اس سجدے کی ادائیگی کے لیے آستاں چاہیے۔ یہ ایک نفسیاتی اور روحانی حقیقت ہے کہ انسان فطرتاً کسی نہ کسی ہستی پر یقین رکھتا ہے اور اس کے سامنے سر جھکانا چاہتا ہے۔ اگر اسے حقیقی معبود، یعنی اللہ تعالیٰ، کا تعارف نہ ہو تو وہ اپنی اس فطری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کسی اور چیز کو معبود بنا لیتا ہے۔

خدا سے تعارف نہ ہو تو انسان کبھی بت کو، کبھی کائنات کو، کبھی فطرت کو خدا مان لیتا ہے۔ یہ تاریخی اور فلسفیانہ طور پر بھی سچ ہے۔ جب انسان نے اپنے خالق کو پہچاننا چھوڑ دیا، تو اس نے پتھروں، درختوں، سورج، چاند، اور اپنے ہاتھوں سے بنائے گئے مجسموں کو پوجنا شروع کر دیا۔ یہ دراصل اس کے اندر کی عقیدت کی پیاس تھی جو کسی بھی طرح بجھنا چاہتی تھی۔ اگر انسان کسی بھی سبب سے یا ماحول سے متاثر ہو کر انکار بھی کرتا پھرے تو بھی جب مصیبت میں گھرا ہے تو بے ساختہ اپنے معبود کو پکارتا ہے اس لیے کہتے ہیں کہ ڈوبتے جہاز میں کوئی منکر خدا نہیں ہوتا۔

یہ خیال اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کی روحانی تشنگی کو صرف اور صرف اس کے حقیقی معبود کی معرفت ہی سیراب کر سکتی ہے۔

اپنے محور پہ رہ نہیں سکتی،
جو زمیں آسماں تلاش کرے

نثار ترابی

یہ شعر روانی اور سبک بیانی میں سہل ممتنع کی اک مثال ہے۔ اس میں شاعر نے وظیفہ حیات کی اہمیت اور حدود کے شعور کو سامنے کی مثال سے واضح کیا ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ زمین کا کام اپنے محور پر گھومنا ہے اور اگر وہ آسمان کی تلاش میں نکل پڑے تو اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ اپنی شناخت اور ٹھکانہ کھو بیٹھے گی۔ شعر میں یہ نہیں کہا جا رہا کہ اونچے آدرش کی طرف بڑھنا ہی نہیں چاہیے۔ اعلیٰ تمنائیں انسان کی ترقی کے لیے چراغ راہ کا تیل ہیں۔

شعر کا مقصد اونچے آدرشوں کی مخالفت نہیں، بل کہ توازن اور حقیقت پسندی پر قائم رہنا ہے۔ ''اپنے محور پر رہنا'' کا مطلب یہ نہیں کہ آپ قید ہو گئے ہیں اور آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بنیادی اقدار، اپنی شناخت اور اپنی حقیقت کو کبھی فراموش نہ کریں۔ جب آپ اونچے اہداف کی طرف بڑھیں، تو اپنی جڑوں کو مضبوط رکھیں۔ اگر آپ اپنی بنیاد ہی چھوڑ دیں گے تو آسمان تک تو کیا پہنچیں گے اپنے حاصل کردہ مقامات بھی کھو بیٹھیں گے۔

اگر زمین اپنے محور سے ہٹ جائے یا جھکاؤ کا زاویہ کم زیادہ ہو جائے تو موسموں کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ کچھ علاقے شدید سردی کی لپیٹ میں آ جائیں گے جبکہ کچھ میں ناقابل برداشت گرمی ہو گی۔ اس سے زراعت اور زندگی ختم ہو جائے گی۔ محور کے ہٹنے سے دن اور رات کی لمبائی بھی متاثر ہو گی۔ اگر زمین کا گھومنا رک جائے تو آدھی زمین پر ہمیشہ دن رہے گا اور دوسری آدھی پر ہمیشہ رات۔ دن والے حصے میں درجہ حرارت بہت بڑھ جائے گا اور رات والے میں بہت کم ہو جائے گا، جو زندگی کے لیے سازگار نہیں ہو گا۔ زمین کی سطح اور اس کے اندرونی حصے میں توازن اس کے گھومنے سے برقرار رہتا ہے۔ محور کے ہٹنے سے یہ توازن بگڑ جائے گا جس کے نتیجے میں شدید زلزلے، آتش فشاں کا پھٹنا، اور زمین میں دراڑیں پڑنا جیسے واقعات عام ہو جائیں گے۔ زمین کا گھومنا سمندروں کی لہروں اور بہاؤ کو بھی کنٹرول کرتا ہے اگر محور میں تبدیلی آئی تو سمندروں کی سطح اوپر نیچے ہو جائے گی، جس سے ساحلی علاقے ڈوب جائیں گے۔ زمین کا گھومنا ہی اس کی کشش ثقل اور فضا کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر یہ نظام بگڑ گیا تو فضا آہستہ آہستہ خلا میں ختم ہو جائے گی، جس سے زمین پر سانس لینا ممکن نہیں رہے گا۔

یہ سب کچھ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ زمین کا اپنے محور پر قائم رہنا کائنات کا ایک انتہائی نازک اور اہم حصہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ شعر کہتے ہوئے کیا نثار ترابی صاحب کو فلکیات اور زمیں کا اپنے محور پر رہنے کی ناگزیریت اور محور سے ہٹنے کی صورت میں تمام ردعمل اور خمیازوں کا علم تھا؟ اس کا حتمی جواب تو نثار ترابی صاحب ہی جانتے ہیں مگر ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ زمیں کے محور پر رہنے کے افادیت اور ہٹنے

کے نقصانات کا خاکہ نثار ترابی صاحب کے لاشعور میں ضرور ہوگا۔ استعارے میں جن دو چیزوں کو آمنے سامنے لا کر اک تقابل کیا جاتا ہے شاعر ان دونوں مقامات کی اک دھندلی سی تصویر لاشعور کی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے پھر وہ قاری کو دعوت دیتا ہے کہ اگر دیکھ سکتا ہے تو ذرا اوپر اٹھ کر پنجوں کے بل اس کا نظارہ کر لے۔ شاعر کی اسی ذہنی استعداد کو سقراط نے یوں بیان کیا تھا ''استعارے کی قوت سب سے بڑی قوت ہے کہ شاعر ایسی مماثلتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اور کسی علم میں ممکن نہیں''

نثار ترابی صاحب اس مماثلت کو اک اور سلیقے سے بھی ظاہر کیا ہے۔ لفظ ''جو'' نے ان تمام خطرات کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو زمین کے محور کو چھوڑ دینے سے منڈلا رہے ہیں۔

''زمین کا آسمان تلاش کرنا'' کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ غلط سمت میں بھاگ رہے ہیں۔ اگر آپ کی صلاحیتیں کسی اور شعبے میں ہیں اور آپ کسی دوسرے بڑے شعبے میں بے جا کوشش کر رہے ہیں تو یہ آپ کے وسائل کا زیاں ہے۔ آپ جتنی رفتار بڑھائیں گے اسی تیزی سے اپنی منزل سے دور ہوتے جائیں گے۔

اس شعر میں ''زمین'' انسان کی اصل اور ''آسمان'' بے جا خواہشات کی علامت ہے نثار ترابی شاید یہ کہہ رہے کہ جب کوئی انسان اپنی حیثیت، اپنی اصل اور اپنے دائرہ کار کو چھوڑ کر ان چیزوں کی طرف بھاگتا ہے جو اس کے لیے ممکن نہیں ہیں، یا جو اس کی فطرت کے خلاف ہیں، تو وہ اپنی بنیاد اور سکون کھو دیتا ہے۔ وہ بے چین ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی میں توازن برقرار نہیں رکھ پاتا۔

''جو زمین آسماں تلاش کرے'' میں اک طنزیہ تناؤ بھی ہے۔ آسمان سامنے کی چیز ہے اور ہمہ گیر ہے کہ چھت کی طرح سب کے سر پر تنا رہتا ہے۔ اب ایسی حاضر اور موجود شے کو تلاش کرنا ایسے ہی ہے جیسے مچھلی پوچھے دریا کدھر ہے؟ یا ایک گھڑ سوار اس گھوڑے کو تلاش کرنا شروع کر دے جس پر وہ سوار ہے۔ ایسی تلاش نہ صرف یہ کی بے سود ہے بل کہ ڈھونڈنے والے کی عقل پر طنز بھی ہے۔

فقط گیارہ الفاظ میں اتنے معانی سمو دینا قدرت کلام کے بغیر ممکن نہیں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر پونم نورین کے تین افسانے ایک تنقیدی تجزیہ

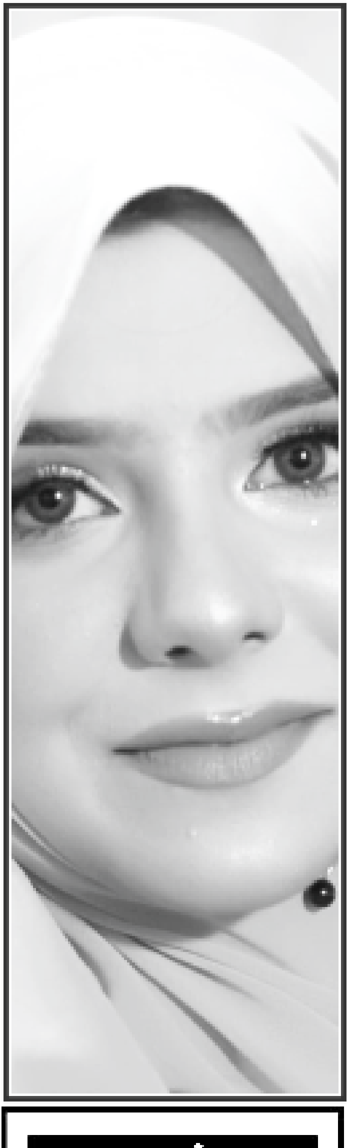

ارفع ناصر

میرے سامنے اس وقت ڈاکٹر پونم نورین کے افسانوں کا مجموعہ ''غلام نہیں گوہر نایاب ہوں'' رکھا ہوا ہے۔ یوں تو اس مجموعے میں شامل سارے ہی افسانے دل کو چھو لینے والے ہیں کیوں کہ ان سب میں زندگی کے چلتے پھرتے کردار نظر آتے ہیں۔ ان کے ہر افسانے کا مرکزی کردار کوئی نہ کوئی عورت ہے۔ میں یہ کتاب پڑھنے بیٹھی تو پڑھتی ہی چلی گئی لیکن اس میں شامل تین افسانوں نے مجھے کافی دیر تک روکے رکھا اور اسے سحر میں جکڑے رکھا۔ وہ تین افسانے درج ذیل ہیں:

''غلام نہیں گوہر نایاب ہوں''

''عین موقع پر اس نے یہ کر دی''

''وہ تین کرسیاں''

اس سے پہلے کے میں ان افسانوں پر بات کروں میں آپ کو بتاتی چلوں کے ڈاکٹر پونم نورین پیشے کے لحاظ سے معالج ہیں، انھوں نے فاطمہ جناح میڈیکل یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کیا۔ مسیحائی اور طرز مسیحائی دونوں سے مکمل آگاہی کے باوجود اللہ کا شکر ہے کہ ان کے اندر کی معصوم، پاکیزہ، محبت کرنے والی پونم ہمیشہ زندہ و کامران رہی۔ قومی زبان اردو کے ساتھ ماں بولی پنجابی کو بھی نہ صرف

روزمرہ زندگی میں بڑے پیار کے ساتھ شامل رکھا بلکہ پنجابی میں بھی شاعری، افسانہ نگاری، کالم نگاری، ناول نگاری کے شوق کو خوب پروان چڑھایا، ادب سے عشق ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا رہا اور اپنے شوہر ڈاکٹر شاہد اشرف کے تعاون سے انھوں نے انتہائی قلیل عرصے میں ادبی دنیا کے حوالے سے اپنی چھ تصانیف پیش کیں جن کے نام کچھ یوں ہیں:

(1) عشق جاوداں (2) خواب ٹوٹ جاتے ہیں (3) ''میری آنکھوں سے محبت کرلو'' (4) ''ہم ترا دل چرائے بیٹھے ہیں (5) ''پونم کی رات میں'' (6) ''خالی میرے دونوں ہاتھ''

پچھلے پچیس سال سے لاہور کے ایک پس ماندہ علاقے میں وہ اپنی طبی خدمات مہیا کرنے میں مصروف ہیں اور ساتھ ساتھ شاعری، کالم نگاری، افسانہ نگاری، ناول نگار اور بچوں کا ادب تخلیق کرنے میں مصروف ہیں۔ ''غلام نہیں گوہر نایاب ہوں'' ان کی ساتویں تخلیق ہے یہ ان کے دل کی آواز ہے جس میں انھوں نے تمام دنیا کی خواتین کی نمائندگی کرنے کی کاوش کی۔ وہ چونکہ کارِ مسیحائی سے وابستہ ہیں اور لاہور کے اس علاقے میں طبی خدمات انجام دے رہی ہیں جہاں نسبتاً کمزور، غریب اور کم وسائل والے لوگ رہتے ہیں جن کے پاس سنانے کے لیے بہت سی دردبھری کہانیاں ہوتی ہیں۔ پونم نورین ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں ان کی شاعری میں درد ہوتا ہے نمر ہوتا ہے دوسروں کا دکھ ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں بھی کہیں کہیں شعروں اور چھوٹی چھوٹی نظموں کی پیوندکاری ہوتی ہے۔

ان کا پہلا افسانہ ''غلام نہیں گوہر نایاب ہوں'' ایک ایسی امیرزادی نزل کی کہانی ہے جو سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ اچھی تعلیم و تربیت اور اور خاندانی ادب آداب نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اس کی تمیزداری اور حیا اس کا زیور تھا۔ منگنی، مہندی، مایوں، نکاح، رخصتی، ولیمہ اور شادی کی تمام رسومات خوشی خوشی ادا کر کی گئی۔ نزل کو اس کے گھر والوں نے ایک قیمتی گاڑی دی تھی لیکن اس کے سسر نے شاید گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک نئی اور مہنگی گاڑی خریدنے کا اعلان کر دیا، جس سے نزل کا دل ٹوٹ گیا۔ بیٹیاں اپنے گھروں سے جو چیزیں لے کر آئی تھی ان سے ان کی جذباتی وابستگی ہوتی ہے اور وہ ان چیزوں کو زندگی کی آخری سانس تک اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ چیز کتنی بھی خراب کیوں نہ ہو جائے وہ اسے دوبارہ ٹھیک کراتی ہیں اور سنبھال کر رکھ لیتی ہیں۔ سبب اس کا یہ ہوتا ہے کہ اپنے گھر سے لائی ہر چیز میں سے بیٹیوں کو اپنے ماں

باپ اور بہن بھائی کی خوش بو آتی ہے۔ جنھوں نے خون پسینہ ایک کر کے وہ خریدیں ہوتی ہیں۔ اس افسانے کا پلاٹ نہایت سیدھا سادھا ہے کوئی الجھاؤ نہیں سیدھی سیدھی وہی کہانی ہے جو ہمیں ہر دوسرے گھر میں دکھائی دیتی ہے۔ بیشتر گھرانوں میں شوہر ہی اپنی نئی نویلی بیگمات کی چیزوں کو بیچنا شروع کر دیتے ہیں اور ساس سسر بیٹوں کو ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں لیکن اس افسانے میں خود سسر صاحب نے وہ کردار ادا کیا جو عام طور پر بیٹوں کا ہوتا ہے۔ اسے افسانے میں وحدت تاثر مکمل شکل میں نظر آتی ہے۔ شروع سے آخر تک ایک ہی لہر ہے جسے قاری محسوس کرتا ہے۔ مکالمہ اس کہانی میں کوئی نہیں ہے۔ پوری کہانی مصنفہ نے بیانیہ انداز میں کہی ہے۔ جیسے وہ دور کھڑی سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔ البتہ اس افسانے میں کرداروں کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے نزل کے ماں باپ اور بہن بھائی کہاں ہیں؟ اس کا شوہر سامنے کیوں نہیں آیا؟ ساس نندیں اور دیور کہاں ہیں؟ جب اس کے سسر نے اس کی گاڑی بیچنے کا شوشا چھوڑا تو ان کا کیا ردِ عمل تھا۔ یہ خلا صاف محسوس ہوتا ہے اگر یہ سب کردار بھی اپنی اپنی جگہ اپنا کردار ادا کرتے تو کہانی میں مزید دلچسپی پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ افسانہ بھی ان کے دوسرے تمام افسانوں کی طرح تانیثیت کا نمائندہ ہے۔ یہ افسانہ پڑھ کر مجھے (مرحومہ) شاعرہ شبنم شکیل کی چھوٹی بحر کی ایک غزل کے چند شعر یاد آ گئے لگتا ہے کہ اس افسانے کا مرکزی کردار نزل اس غزل کا بھی مرکزی کردار ہے:

دکھ کا منتر پڑھی ہوئی ہوں
میں غربت میں بڑی ہوئی ہوں
ان میں وقت ہی ضائع ہو گا
جن باتوں میں پڑی ہوئی ہوں
راج سنگھاسن ہے یہ میرا
یا سولی پر چڑھی ہوئی ہوں
آدھی ریت سے باہر ہوں میں
آدی ریت میں گڑی ہوئی ہوں
آدی مان چکی ہوں اس کی
آدھی بات پہ اڑی ہوئی ہوں
مجھ کو گرانا سہل نہیں ہے
اپنے سہارے کھڑی ہوئی ہوں

....

اس افسانے کی زبان سادہ اور رواں ہے کہیں کوئی الجھاؤ نہیں البتہ کہیں کہیں مصنفہ نے ناصحانہ انداز اپنایا ہے۔ اور لوگوں کو خدا کا واسطہ دے کر کہا ہے کہ بیٹیوں کو وہی مقام دیں جو نبیؐ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ کو دیا تھا۔ اس افسانے کا انجام انھوں نے اپنی اس مختصر سی نظم پر کیا ہے:

گوہر نایاب ہوں
گوہر نایاب ہوں
اک حسین خواب ہوں

تیرے واسطے رحمت
میں کہاں عذاب ہوں
تیرے غم میں مضطرب
درد میں بے تاب ہوں
بابا تیری بیٹی ہوں
میں تو تیرا بھاگ ہوں
میں نہیں غلام سن
گوہر نایاب ہوں
عہد جہالت کے ہر
سوال کا جواب ہوں
ہنر بے مثال میں
قلم ہوں کتاب ہوں
یونم اس جہان کا
میں تو ماہتاب ہوں

....

ان کا دوسرا افسانہ بھی تانیثیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر یونم نورین نے اپنے اس افسانے میں بھی خواتین ہی کے مسائل کو مدِ نظر رکھا ہے ان کی کہانیاں عام طور پر ان موضوعات پر ہوتی ہیں جو ہمیں زندگی میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ عام آدمی بھی یہ سب کچھ دیکھتا ہے لیکن وہ ان پر چند آنسو بہا کر یا قہقہہ لگا کر آگے گزر جاتا ہے۔ جب کہ ایک لکھنے والا شخص چونکہ حساس ہوتا ہے اس لیے وہ ہر واقع کو دیکھ کر دل سے محسوس کرتا ہے اس لیے وہ سب کچھ اس کی غزل، نظم افسانے کی شکل میں لکھ ڈالتا ہے یوں کبھی کبھی اپنے اور کبھی دوسروں کے تجربات تخلیق کی شکل میں سامنے لیے آتا ہے۔ شاید اسی لیے احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا:

میں کھل کے رو نہ سکا جب تو یہ غزل کہہ لی
بچھڑ کے مجھ سے مگر تو نے کیا کیا ہو گا

....

گویا تخلیق کے انخلا نے جذبات یعنی کیتھارسز (Cathrsis) کی دوسری شکل ہے اور یہ سہولت صرف تخلیق کاروں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ ان کے دوسرے افسانے کا نام ہے۔ "عین موقع پر اس نے نہ کر دی" اس کا مرکزی کردار صنم ذوالفقار ہے اور اس کا شوہر خرم سبطین ثانوی کردار کی شکل میں آتا ہے۔ اس افسانے کی دیگر کرداروں میں زیرک، شیریں بہزاد، نازی، محمود، خرم، نیازی اور سبط روشان ہیں لیکن سب سے اہم کردار صنم ذوالفقار کا ہے۔ اس افسانے کی کہانی یہ ہے کہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی صنم کی شادی ایک امیرزادے خرم سبطین سے ہوتی ہے جو گھر والوں نے طے کی تھی شادی کا اہتمام شہر کے ایک سیون سٹار ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کیے ہوں گے دونوں طرف سے خوب دکھاوا کیا گیا تا کہ دونوں خاندان معاشرے میں فخر سے اور سر اٹھا کر چل سکیں۔ لیکن عین نکاح کے وقت صنم ذوالفقار شادی سے انکار کر کے کہانی کو ایک نیا رُخ دے دیتی ہے دراصل صنم ذوالفقار کا

سوشل میڈیا کے ذریعے کسی اور لڑکے سے رابطہ ہوتا ہے اور اسی کے کہنے پر اس نے یہ انکار کیا تھا عین موقع پر اس نے انکار کیا تو صنم کی خالہ زیرک فاطمہ نے فوری طور پر اپنی اکلوتی اور ہونہار بیٹی کو نکاح کے لیے راضی کرلیا۔ دولہا بھی مان گیا اور دولہے کے گھر والے بھی یوں ایک گھر میں خوشیاں آگئیں اور دوسرے گھر میں موت کی خاموشی چھا گئی۔ کچھ عرصے کے بعد صنم ذوالفقار اپنے سوشل میڈیائی عشق کے نتیجے میں پاگل خانے پہنچ گئی۔ صنم نے جس شخص سے نکاح کرنے سے انکار کیا تھا وقتی طور پر وہ ہمیں سیاہ بخت محسوس ہوتا ہے اور بخت کے تخت سے اتارا ہوا شخص محسوس ہوتا ہے لیکن دوسری طرف جب اس کی شادی اسی وقت شیریں بہزاد سے ہو جاتی ہے تو وہ دنیا کا سب سے زیادہ خوش بخت آدمی بن جاتا ہے وہی تو وہی آدمی اصل میں خوش قسمت ہوتا ہے جو ٹھوکر لگتے ہی سنبھل جائے اور گرنے سے بچ جائے خرم گرنے سے بچ گیا تھا لیکن صنم بدبختی کے گہرے غار میں گر چکی تھی اس پر مصنفہ پونم نورین نے ایک شعر لکھا ہے:

زمانہ چال اپنی چل چکا تھا
کوئی مرنے سے پہلے مر چکا تھا

....

اس افسانے میں منظرکشی اور مرقع نگاری عروج پر نظر آئی ہے۔ شادی کے بیان میں ایک ایک جزیات کو یوں درج کیا گیا ہے کہ امیر گھرانے کی شادی کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ پونم نورین اپنے افسانوں میں جابجا شعروں کی پیوندکاری کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں عرض کروں گی کہ اس افسانے میں انھوں نے چار اشعار استعمال کیے ہیں اور برمحل ہیں اور کہانی کی مناسبت سے ہے۔ اس افسانے کا اختتام بھی انھوں نے ایک چھوٹی سی نظم پر کیا ہے جس میں لڑکیوں کے اندر کا خوف نظر آتا ہے۔ وہ نظم درج ذیل ہے:

وہ مجھے اس جگہ جا ماریں گے
وہ مجھے اس جگہ جا ماریں گے
جہاں پھولوں کے رنگ پیلے ہوں گے
جہاں تتلی کا رنگ سلونا اور
جہاں خوشیوں کے پل تھوڑے ہوں گے
جہاں منڈیریں کوؤں سے خالی
جہاں کنوؤں میں نہ پانی ہو گا
لوگ ، لوگوں سے خار کھائیں گے
بھولے لوگوں کو آزمائیں گے
وہ مجھے اس جگہ جا ماریں گے

....

ڈاکٹر پونم نورین کا تیسرا افسانہ ”وہ تین کرسیاں“ ہے جو اس وقت میں پیش نظر ہے یہ ہر لحاظ سے مکمل افسانہ ہے، جس کی کہانی گھر گھر میں نظر آتی ہے لیکن اس افسانے کے مرکزی کردار بھی خواتین ہی پر مشتمل ہیں۔ یہ

افسانہ نئی حسیات کا افسانہ ہے۔ اس میں اس بات کو سامنے لایا گیا ہے کہ حساس لوگوں کو صرف انسانوں ہی سے نہیں ان چیزوں سے بھی پیار ہو جاتا ہے جن کے ساتھ ان کا ایک طویل وقت گزرتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ افسانہ دراصل ایک گھرانے کی چھ کرسیوں کا ہے۔ اور اتفاق دیکھیے کہ اس گھرانے میں چھ ہی بہن بھائی تھے۔ چار بہنیں اور 2 بھائی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد اور سب بہن بھائیوں کی شادیاں ہو جانے کے بعد ہمارے ہر گھر میں تقسیم کا المیہ پیدا ہوتا ہے۔ بہن بھائی زمین جائیداد اور روپے پیسے اور دوسری چیزوں پر لڑتے جھگڑتے ہیں ان میں سے بیشتر کی ان چیزوں سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہوتی صرف ایک اثاثے کی ملکیت کا احساس ہوتا ہے جب کہ ان میں سے کوئی ایک بہن یا بھائی ایسا ضرور ہوتا ہے جس کی ان چیزوں سے جذباتی وابستگی ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ماں باپ کی نشانیوں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔

اس افسانے میں ایک ایسی ہی بہن کے جذبات کو بیان کیا گیا ہے جو اپنے ماں باپ کی چھوڑی ہوئی چھ کرسیوں کے تقسیم کے المیے پر رنجیدہ ہے دونوں بھائیوں نے کرسیوں کو صرف چیزیں سمجھا اس لیے دونوں نے تین تین اپنے گھر میں رکھ لیں اور آخرِ کار دونوں نے وہ کرسیاں اپنی بیویوں کے مشورے سے کباڑی کے ہاتھ بیچ ڈالی۔ اس افسانے سے یہ پتا چلتا ہے کہ بیٹیاں ماں باپ کی یادوں کو سینے سے لگا کر رکھتی ہیں اور بیٹے انھیں بھلا دیتے ہیں۔ ایسے ہی بیٹے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں لاوارث بزرگوں کے لیے اولڈ ہاؤس قائم کر دیے گئے ہیں۔ جہاں دبی دبی سسکیوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ خوشی وہاں نام کو نہیں ہوتی البتہ پچھتاوا ہی ہوتا ہے۔

ان کے افسانوں کا تجزیہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ افسانے کی صنف کے بارے میں کچھ جان لیا جائے۔ یہ دیکھ لیا جائے کہ افسانہ کیا ہوتا ہے؟ کہانی کیا ہوتی ہے؟

افسانے کو انگریزی میں Short Story کہتے ہیں۔ یہ داستان اور ناول کے بعد آنے والی صنفِ نثر ہے۔ ایک مشہور امریکی افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو کا کہنا ہے: ”افسانہ ایک ایسی نثری کہانی ہے جسے پڑھنے میں ہمیں آدھ گھنٹے سے دو گھنٹے کا وقت لگے۔“

داستان اور ناول مطالعے کے لیے بہت سا وقت مانگتے ہیں جب کہ افسانہ اپنے اختصار کے مطابق بہت کم وقت میں ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکتا ہے۔ افسانے کی ضرورت کا احساس غالباً تب پیدا ہوا جب انسانی مصروفیات بڑھنے لگیں اور اس کے پاس وقت کی قلت رہنے لگی۔ ایڈگر ایلن پو کی بات سے کچھ آگے دھیان دیا جائے تو

کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ کسی انسان کی زندگی کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالتا ہے ناول کی طرف افسانے میں بھی کچھ کردار ہوتے ہیں- مکالمے بھی ہوتے ہیں-

افسانے کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(1) وحدت تاثر (2) اختصار
(3) موضوع اور پلاٹ (4) افسانیت
(5) اسلوب بیاں (6) تکنیک

1- وحدت تاثر: وحدت تاثر کا مطلب یہ ہے کہ افسانے کے آغاز میں جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ افسانے کے اختتام تک قائم رہے- یہ افسانے کی سب سے بڑی خوبی ہے-

2- اختصار: افسانے کی ایک اور بنیادی پہچان- اس کا مطلب ہے کہ افسانہ نگار کم سے کم الفاظ میں، نہایت جامعیت کے ساتھ کسی بڑے موضوع اور بڑے واقعے کو سمیٹے-

3- موضوع اور پلاٹ: افسانے کے واقعات کی تفصیل کو ایک ترتیب سے پیش کرنا پلاٹ کہلاتا ہے- موضوع افسانے کی جان ہوتی ہے- ہر واقعہ اگلے واقعہ سے جڑا ہونا چاہیے- ایک مشاق افسانہ نگار موضوع اور پلاٹ پر خاص توجہ دیتا ہے-

4- افسانویت: جس طرح ہر شعر میں وزن کے ساتھ شعریت ضروری ہوتی ہے اسی طرح ہر افسانے میں افسانویت ضروری ہوتی ہے- افسانویت کا مطلب ہے کہ کہانی سپاٹ انداز میں بیان کرنا- اظہارِ تخلیقی اور اسلوب ادبی ہونا چاہیے-

5- اسلوب بیان: ہر ادبی تخلیق کی طرح افسانہ بھی ایک خاص الوب بیان کا متقاضی ہے- علم بیان اور علم بدیہہ کے مختلف رنگ افسانے کے اسلوب کا تعین کرتے ہیں- افسانہ نگار کی زبان کرداروں کے مقام، مرتبہ، عمر اور علم کے مطابق ہونی چاہیے-

6- تکنیک: تکنیک سے مراد وہ طریقہ کار لیے جسے استعمال کر کے افسانہ نگار اپنے موضوع کو افسانے کا رنگ دیتا ہے- سب سے پہلی تکنیک، بیانیہ، تکنیک ہے- اس میں سیدھے سادھے انداز میں کہانی بیان کر دی جاتی ہے- دوسری تکنیک مکالیاتی تکنیک ہے- اس میں کردار عمل سے زیادہ، باتیں کرتے نظر آتے ہیں- ایک تکنیک فلیش بیک کی ہے جس میں حال میں موجود کردار اچانک ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اس میں افسانہ نگار اور قاری دونوں کو مشکل ہوتی ہے- ایک کو لکھنے اور دوسرے کو کہانی سمجھنے میں- ان دونوں علامتی افسانہ بھی لکھا جا رہا ہے-

آخر میں یہ کہوں گی کہ پونم نورین ایک مسیحا ہی نہیں ہیں بلکہ وقت کی نباظ بھی ہیں- وہ انسانوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی کشاکش اور احساسات کو سمجھتی ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں ایک اچھے تخلیق کار کی طرح افسانے کی شکل میں ڈھلنا بھی جانتی ہیں-

☆☆☆☆☆

دیسی پروفیسر ڈاکٹر ایاز محمد رانا

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

....

سب طرف سرائے سیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ ہو کا عالم تھا۔ رانا آ رہا ہے، رانا آ رہا ہے، کسی کو نہیں چھوڑے گا کسی کو نہیں چھوڑے گا۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے چیئر مین خواجہ القما یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے تھے اور چیئر مین کی سیٹ خالی ہو گئی تھی۔ رانا صاحب اس وقت نیپال میں اقبال کی کرسی iqbal chair سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ جب تک اقبال کی کرسی پر بیٹھے رہے اقبال کی روح دہائیں دیتی رہی۔ بقول جملہ شاف ہذا جیسے رانا صاحب نے ڈیپارٹمنٹ میں انٹری دی تو ہمیں زکوٹا جن کی یاد آ گئی چھوٹا قد شدید گندمی رنگ اور سفید بال ڈاکٹر ایاز محمد رانا نے سیاسیات کا ڈیپارٹمنٹ سنبھال لیا تھا۔ میں اس وقت ایم فل کا طالب علم تھا کورس ورک ختم ہو چکا تھا اور میں نے اپنی تحقیق کی تجویز research proposal جمع کروا دیا تھا اور فیاض صاحب کو اپنا سپروائزر تجویز کیا تھا۔ فیاض صاحب اللہ لوک بندے تھے اور ریٹائرمنٹ کے قریب تھے رانا صاحب کے آنے کی دیر تھی انہوں نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور کہا تم رانے کو اپنا سپروائزر رکھ لو ورنہ وہ تمھیں ایم فل نہیں کرنے دے گا میں ریٹائرمنٹ کے نزدیک ہوں اور اگر تمھارا کام میں تھوڑی تاخیر ہوئی تو پھر دیکھ لینا میرا ذمہ نہیں ہوگا۔ اس طرح رانا صاحب میرے سپروائزر بن گئے۔ مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق میں ان کے دفتر کے چکر لگانے لگا میں جب بھی کام کر کے کوئی باب لکھ کر جاتا وہ تھوڑا سا دیکھ کر کہہ دیتے ابھی مزید بہتر کرنے کی ضرورت ہے اور واپس کر دیتے۔ اس طرح کچھ چکروں میں جب میں چکروں چکری ہو چکا تھا جان گیا رانا صاحب پڑھتے وڑتے نہیں ہیں اس لیے میں نے باب آگے لکھنا شروع کر دیے اور

محمد کلیم

پچھلا کام ویسے کا ویسا دوبارہ لے جاتا چار پانچ چکر کے بعد وہ فرماتے اب ہوئی نہ بات کلیم سائیں اب لکھا ہے اور میں اندر ہی اندر رانا صاحب کو داد دیتا اور چلا آتا کچھ عرصے میں مجھ پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ رانا صاحب پروفیسر نہیں بل کہ گاؤں کے نمبردار ہیں وہ بے شک اپنا تعلق بڑے بڑے لوگوں سے بتاتے تھے لیکن ان کے سارے کام مجھے ہی کرنا پڑتا تھے ان کا تعلق سرگودھا کی تحصیل کوٹ مومن سے تھا لیکن بسلسلہ نوکری ملتان آباد ہوگئے تھے اور ترقی کی منازل طے کرتے کرتے پروفیسر بن بیٹھے تھے لیکن ان کے ذہن میں ابھی تک قلق تھا کہ وہ نائب تحصیل دار بھرتی ہوگئے تھے انھوں نے وہ نوکری کیوں نہیں کی بل کہ یونیورسٹی میں لیکچرر لگ گئے بقول ان کے یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی۔

میرا ان کی ساتھ لمبا چلا پھر پی ایچ ڈی کر کے ہی انھوں نے مجھے اور میں نے ان کو فارغ کیا بل کہ یوں کہنا چاہیے میں نے ان کو فارغ کیا وہ ابھی بھی مجھ سے رابطے میں ہیں اور محبت نامے بھیجتے رہتے ہیں پکے جماعتیے ہیں اس لیے ان کو اپنے سوا تمام لوگ کرپٹ/بد دیانت اور برے نظر آتے ہیں۔ ویسے آپس کی بات ہے یہ تمام خصائص ان میں بھی بدرجہ موجود ہیں درخواست بازی کا ان کو اتنا شوق ہے کہ ہر دوسرے پروفیسر کے خلاف گورنر سیکرٹری اینٹی کرپشن اور نیب میں درخواستیں دے رکھی ہیں۔ اپنے خرچے پر ہر پیشی پر بیان دینے بھی پہنچ جاتے ہیں بعض مرتبہ مجھے لگتا ہے کہ ان کو ان ایجنسیوں نے خود رکھا ہوا ہے اور وہ سورس رپورٹ پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے ان کو کافی نقصان بھی ہوا لیکن وہ اپنی ضد کے پکے ہیں اور مجرم کو انصاف دلا کر ہی دم لیتے ہیں۔ میں نے بطور استاد ان کو اخروٹ کی طرح پایا جس کا چھلکا سخت ہوتا ہے لیکن اندر سے بھرپور نرم ہوتا ہے۔ یہاں کاغذی اخروٹ سمجھنا آپ کی غلطی تصور کیا جائے گا۔ ایک بار جس کو اپنے حلقہ شاگردی میں لے لیں پھر کوئی مائی کا لال اس میں سے نہیں نکل سکتا۔ لیکن ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ طالب علم کا وقت ضائع نہ ہو بل کہ کام چلتا رہے یہی وجہ ہے کوئی عرصہ آٹھ سال میں، میں نے اپنی پی ایچ ڈی کر لی اس میں تاخیر کی وجہ بھی میں تھا کیونکہ ایم فل کرنے کے بعد کوئی ڈیڑھ سال بعد میں نے

اپنا پی ایچ ڈی کا کورس ورک شروع کیا۔ میں اکثر چھٹی کے دن ان کے گھر تشریف لے جاتا وہ سائیں سائیں کہتے نہ تھکتے وہ پھلوں سے میری تواضع کرتے، چائے پلاتے اور اگر زیادہ وقت ہو جاتا تو کھانا بھی کھلاتے اور خوب باتیں کرتے۔ یہاں پر یہ بات بتانا ضروری ہے کہ اس وقت تک میں مقابلے کا امتحان دے کر سول سروس جوائن کر چکا تھا ان کی باتوں کے موضوع علاقائی سیاست سے قومی سیاست اور میری نوکری ہوتے ان کا دل کرتا کہ وہ میری جگہ اسسٹنٹ کمشنر بھرتی ہو جائیں ویسے یہ میرا قیاس ہے کیونکہ ان دنوں وہ اپنی تحصیل داری کو بہت یاد کرتے تھے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے ان کے تین عدد بیٹے بالکل ان جیسے تھے دو ماشاء اللہ یونیورسٹی میں لیکچرار ہیں اور ایک مقابلے کی امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور سننے میں آیا ہے۔ ان کی ایک بہو بھی لیکچرار ہے مجھے لگتا ہے یونیورسٹی ان کے دم سے ہی چل رہی ہے۔ تیسرے بچے کا بھی کام ہو جاتا تھا مگر ان کی درخواستیں رکاوٹ بن گئی اس لیے اب وہ مقابلے کی امتحان کی تیاری کر رہا ہے بہر حال جو بھی ہو رانا صاحب یاروں کے یار ہیں اور مجلسی آدمی ہیں کچھ عرصہ پہلے معلوم ہوا انھوں نے نوکری سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا یوٹیوب چینل بنا لیا ہے۔ چینل کے ذریعے معلوم ہوا کہ جناب مزاحیہ شاعری بھی کرتے ہیں:

ایک سیاسی صفت کے لوٹے سے
سیاست باز بگھوڑے سے
سن قیمت میں حیران ہوا
کیوں اتنا مہنگا بکتا ہے

....

آپ بھی ان کے یوٹیوب پر جا کر مزاحیہ شاعری سن سکتے ہیں اور ماشاء اللہ وہ ترنم سے پڑھتے ہیں ہم سے قسم لے لیں کہ ہمیں معلوم ہو کہ وہ لکھتے بھی ہیں نہ انھوں نے بتایا اور نہ ہم نے پوچھا۔

اچی لمبی سوہنی نار
تے سندر رنگ دی ملکہ

....

یہ پنجابی شعر ان کے ذوق کی عکاسی کرتا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں یہ شعر ہی ان کی اصل عکاسی کرتا ہے سننے میں آیا ہے وہ چند دن پہلے ایک بار پھر بیاہ کر کے دلہا بن گئے ہیں۔ واللہ علم بالصواب۔

☆☆☆☆☆

حدی

اے مرے نغمہ گر! اے نغمہ خواں!
نم مژہ ہو نہ جائے صفِ غم کشاں!
دف اٹھا! چھیڑ دے پھر وہی داستاں!

○

گنگنا! کوبکو، رہ گزر، رہ گزر
اے مرے ہم سفر! اے مرے نغمہ گر!
پھر وہی داستاں! دل ربا، جاں ستاں

○

تو ملا، دور دل کا اندھیرا ہوا
روپ کی دھوپ بکھری، سویرا ہوا
فرش سے عرش تک از کراں تا کراں!

○

ان کہی، ان سنی بھی، سنی سی لگے
پیار میں، ان کہی بھی، کہی سی لگے
عشق میں ہجر کا چاند نکلا کہاں

○

تجھ کو کھونا نہ تھا! تجھ کو پانا نہ تھا!
یاد رکھنا نہ تھا! بھول جانا نہ تھا!
ساتھ ہیں، سنگ و سر، آستاں! آستاں!

○

راہ صحرائی ہے، ساتھ تنہائی ہے
میرا زادِ سفر، میری رسوائی ہے
داستان رواں، کارواں، کارواں

○

دشت کی وسعتوں میں بکھر جاؤں گا
خاک ہوں، خاک میں رنگ بھر جاؤں گا
میں بھی ہو جاؤں گا لالۂ دشتِ جاں

○

گم رہو! دیکھنا، یہ وہی شہر ہے
یہ گلی ہے وہی، یہ وہی پہر ہے
دم لیا تھا جہاں، دل دیا تھا جہاں

○

دوستوں نے ہمیں، کیا سے کیا کر دیا!
ہم نوا کر لیا! بے نوا کر دیا!
راہ میں رہ گیا، عشق کا کارواں

خالد احمد

حرفِ سپاس

کوئٹہ کے
کھلے بازو، شکریہ!
پاک گلدان کے
شہ گلو، شکریہ!

شعر و نغمہ ہو،
تمثیل و افسانہ ہو
ارضِ بولان کے
فن گرو، شکریہ!

چاہتوں کے سبھی رنگ
جھولی میں ہیں
محسنو! دوستو!
بھائیو، شکریہ!

جذبۂ دل

محبت سے لبریز ہے
اے وفا کے
گھنے بادلو، شکریہ!

کتنی رنگین یادوں کے
تحفے ملے
دامنِ کوہ کے
رنگجو، شکریہ!

شوق شفاف دل کے
ثمر بار ہوں
امن و راحت کے
موسم جیو، شکریہ!

صاحبِ خواب ہونا
بڑی بات ہے
سب کے سپنوں کی
تکریم ہو، شکریہ!

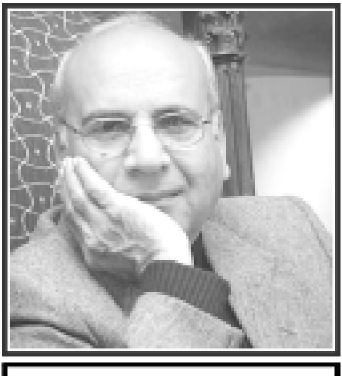

جلیل عالی

ہم مزدوروں نے تو آج بھی کام پہ جانا ہے

کیسی چھٹی؟ کس نے لیبر ڈے کو منانا ہے
ہم مزدوروں نے تو آج بھی کام پہ جانا ہے

ریلیاں، جلسے کسی اَجیر کو کیا دے پائے ہیں؟
یہاں ہر ایک زمانہ ہی آجِر کا زمانہ ہے

تم بھی سچ کہتے ہو، لیکن کڑوا سچ یہ ہے
اِک بھٹہ مزدور نے کیا بچّوں کو پڑھانا ہے

ہم دورانِ کار، اگر جاں سے بھی گزر جائیں
کون ہے، جس نے آ کے ہمارا بوجھ اُٹھانا ہے؟

کون ہمارے بچّوں کا سوچے گا، ہمارے بعد
کس نے ہمارے بعد ہمارے گھر کو چلانا ہے؟

ہم ہی اگر سارے منظرنامے سے نکل جائیں
مُلکی ترقّی اور معیشت محض فسانہ ہے

محنت کش کی عزت ہی، محنت کی عزت ہے
یومِ مئی پہ تمھیں یہی احساس دلانا ہے

یہی شکاگو کے مزدوروں سے یکجہتی ہے
سچے دل سے مزدوروں کا ہاتھ بٹانا ہے

ہم مزدور ہیں، ہم اللہ کے دوست ہیں، جانِ انیس!
یہی حدیث، ہماری بخشش کا پروانہ ہے

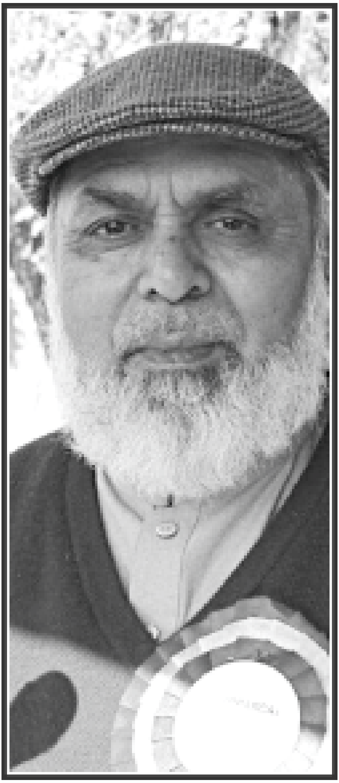

محمد انیس انصاری

حرفوں کا قحط [نثری نظم]

مدہم روشنی درختوں کی اُداسیاں
اور شب کا وسط
قُربتوں کے فاصلے، فاصلوں کی قُربتیں
پرندہ اُڑا، پھر ٹھہرا اور پھر پھڑ پھڑا کر مُڑ آیا
درختوں کی بے ثمری بھول گیا
(پرندہ جو ٹھہرا!)

اُس کی ضد اور پھر اس کی معصومیت
اس کے شب و روز کا سوز و کرب و درد
آدھی شب نے شکوہ اور جواب شکوہ میں تحلیل ہو کر
حرفوں کے قحط اور زبان کی بے نطقی کا روپ دھار لیا

لمحوں کا تسلسل کیوں ٹوٹ جاتا ہے؟
وقت کیوں منجمد نہیں ہوتا؟
فلسفہ و ادب و ذوق جمال
محور انتظار، ربط نہاں
پاپلر، بام اور چاند
سراب قُربت

پرندے، تم اپنے حزن کو چھپا نہ سکے، ہلک پڑے
اور وہ تم ایسے زود پشیماں کے پشیماں ہونے پر
خود بھی پشیمان ہو گیا
کہ تم سے قُرب کی راہ تصور ہے، خیال ہے، جمال ہے

ادھر وگرد زندگی کا مشینی تواتر
سڑکوں پر بے دھیان لوگوں کا اژدہام
مکانوں میں مکیں روبوٹ
تنفس بے یقیں
اور وصل اور ہجر کا درمیانی سفر، مروتوں کا شاخسانہ!

ان کہی سُن رہے ہیں، المیہ ہے
نالسی!
اور 'دلدار نظر کی شبنم'
سُن رہے ہو پرندے!
اب نہ پریشاں ہونا
تُمہارا خیال ہی میری واماندگی کا تریاق ہے!

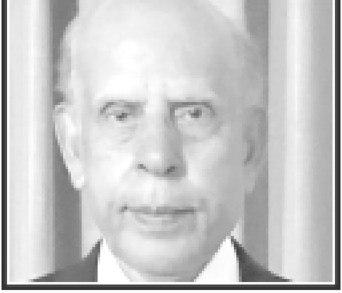

سید افسر ساجد

رسہ کشی

یہ فری سٹائل رسہ کشی ہے
اس کے کوئی اصول نہیں
برابری، تعداد، وقت، جوڑ، لکیر ریفری،
کچھ نہیں
بس طاقت اور مفاد
مفاد اور طاقت
کمزوروں کو کھینچو، گھسیٹو
گراؤ
رگڑو
مارو
کچل کر رکھ دو
سانس نہ لینے دو
سر نہ اٹھانے دو
بات کرنے، بولنے، اکٹھا ہونے کی
مہلت نہ دو
جن میں کچھ دم ہے انھیں خرید لو
بک جائیں گے
یہ غلام ہیں۔
ورنہ بندوق تو ہے ہی۔
جیت ہماری ہوگی
جیت ہمیشہ ہماری ہی ہوتی ہے
ہمیشہ۔۔۔
یہ ہمارا کھیل ہے۔
یہ فری سٹائل رسہ کشی ہے۔

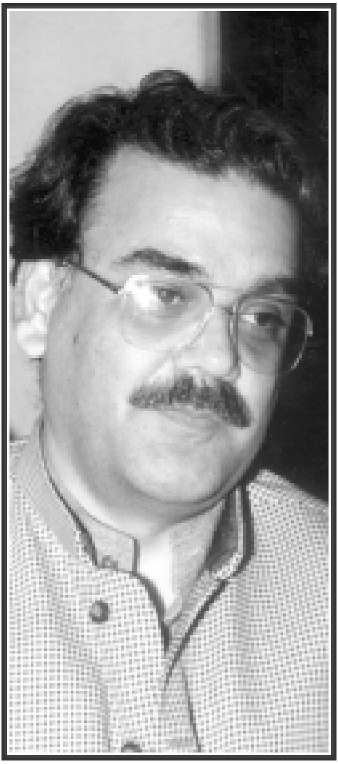

شاہنواز زیدی

دھند میں چھپتا عجائب گھر

کوئی ٹھیکسلا سانس لیتا ہے
پتھری پرچھائیوں میں
کسی چپ کے کلبوت میں
بند الماریوں میں چھپے ہیں وہ بے باک دریا
کبھی جو رواں تھے
پر اب منجمد ہیں
جواہر میں بکھری ہوئی خواہشیں
اور متروک سکے
جو بے وضع سے مرتبانوں میں رکھ کر
کوئی بھول بیٹھا ہے
شاہانہ احکام کے پارچے
یہ پرانے ورق
جذب کیسے کریں گے نئی بارشیں
ریشمی موڑ ہے خواب جیسا کہیں
اب بھی بیٹھا ہے گوتم وہیں
ادھ کھلی اُس کی آنکھیں
سبھی راز ان جان گھرے سے کہنے لگی ہیں
مجسم سکوں ہے کہ کھوئے جزیرے کا نقشہ
مگر صبر
اور جانے کس دھات سے
کس نے ڈھالے یہ سارے نوادر
منقش نوادر
کہ اپنے ہی اندر گھُلے جا رہے ہیں
یہاں سُرخ مٹی کی آواز کوئی بھی سنتا نہیں
بے زبانی کی حیرت
سوالی دیئے پوچھتے ہیں
کہ دنیا یونہی کیسے چلتی رہی ہے ہمارے بنا
یہ بھٹکتا ہوا چاند جاسوس ہے
اندھی راتوں کا
جو گھومتا پھر رہا ہے
یہاں سے وہاں سے یہاں
چاندنی رینگتی ہے
دریچے کے شیشوں پہ
شاید کہیں ہو شگاف
ایک رخنہ
کہ صدیوں کی محبوس تاریخ کو
بھاگ جانے کا رستہ ملے
بھورے سائے میں منہ کو چھپائے یہ
ماضی بھی
نمبر لگا ایک قیدی ہے
اک ایسا قیدی
جو اپنی ہی زنجیر کا خود محافظ بھی ہے

حامد یزدانی

رائیگانی [نثری نظم]

خامشی سے دُھندلائے
شہرِ پُرآشوب میں
جو اِک نحیف سی صدا رہ گئی ہے
وہ میری ہے
وقت کے بے رحم ہاتھوں سے
ریت کی مانند سرکتے لمحے
جو میری زندگی میں رنگ بھرتے تھے
گماں کی گرد میں اَٹ گئے ہیں
اُدھورے خواب
جو بے رنگ آنکھوں میں جھلملاتے
تھکتے ہی نہ تھے
شکستگی کا پَرتو ہیں
یہ آب و رنگ سے عبارت راستے
جو برسوں سے میری راہ گزر تھے
ویرانوں میں ڈھل کر رہ گئے ہیں
اور اب میں
ہوں یا نہیں ہوں کے گرداب میں اُلجھا
وقت اور مقام کے تعاقب میں ہوں
سنو! تم زندگی کے جھمیلوں میں اُلجھا ہوا ہم سفر بدلو
سنو! سمجھو!
یہ مکمل رائیگانی کا سفر ہے

طلعت شبیر

ہمارے عہد کا گوتم

گلوبل دائرے کے سب مجبور لوگوں کو
سسکتی فاختاؤں کو
بھٹکتی آتماؤں کو
زمیں زیر زمیں پھیلے ہوئے حشرات کو
کیڑوں مکوڑوں کو
خزاں کی گود میں بکھرے ہوئے ان زرد پتوں کو
مکینوں کو مکانوں کو
زمینوں آسمانوں کو
سمندر در سمندر کشتیوں کو بادبانوں کو
پہاڑوں کی چٹانوں کو
ہمارے عہد کے گوتم نے یہ پیغام بھیجا ہے
کہ وہ اک سپر پاور ہے
زمیں سے چاند تک پھیلی ہوئی اسکی حکومت ہے
ہواوں پر فضاؤں پر بہت آگے خلاؤں پر
اسی کی حکمرانی ہے
بساط ارض پر سارے کے سارے اسکے مہرے ہیں
جہاں چاہے جدھر چاہے وہ سب کو کھیل سکتا ہے
اگر جاں کی اماں مطلوب ہے تو جاننا ہوگا
بلا چوں و چرا ویسے کا ویسا ماننا ہوگا
جو اسکے منہ سے نکلے گا
جو اسکے منہ سے نکلے گا
مقدر ہے وہی مجبور اور مقہور لوگوں کا
نحیف و ناتواں لوگوں کسی نے دم نکالا تو
دوبارہ دم نہیں لیگا
ہمارے عہد کے گوتم سے تو تاتار اور
منگول بھی چہرہ چھپاتے ہیں
کسی میں کب یہ ہمت تھی وہ بستی بستیوں
کو اس طرح تاراج کر دیتا
زمانے سے اٹھا دیتا
وہ زندہ سانس لیتے شہر ہستی سے مٹا دیتا
پھر ان زیتون کی شاخوں کو شعلوں سے ہوا دیتا
ہمارے عہد کا گوتم
جو تنہا سپر پاور ہے
پھر اسکے پاس اب یہ ڈھال ہے نائن الیون کی
وہ جسکی آڑ لیکر کچھ بھی کر سکتا ہے دنیا میں
جب اسکے پاس لاٹھی ہے تو ہر اک بھینس اسکی ہے
وہ سب کو ہانک سکتا
بجز اپنے گریباں کے کہیں بھی جھانک سکتا ہے
کسی بھی پھول کو کالر میں اپنے ٹانک سکتا ہے
اماں کی دعویداری آشتی کی پاسداری کو
وہی اک ابرہہ باقی بچا ہے عصر حاضر میں
وہ جسکے ہاتھیوں کی فوج ہر سو دندناتی
فلک کو خوں رلاتی ہے
فنا کے گیت گاتی ہے
گلوبل دائرے میں بیٹھ کر اس ابرہہ نے پھر
دہائی دی ہے اسکے ہاتھیوں پہ خوف طاری ہے
اسے اور اسکے لشکر کو ابابیلوں سے خطرہ ہے

لہٰذا ان کی ننھی منی چونچیں توڑ دی جائیں
سپر پاور ہے لیکن پھر بھی اس گوتم کو خدشہ ہے
ابابیلوں کی جانب سے اسے گھمبیر، خطرہ ہے
فضاؤں میں انہیں برباد کر دینا ضروری ہے
گلوبل دائرے کے بے کس و مجبور لوگوں پر
بڑی مشکل کی ساعت ہے
غرور بادشاہی ہے
مقابل، کج کلاہی ہے
ادھر صدیاں ہوئیں تاریخ کا دھارا بتاتا ہے
کلام پاک کا یہ آخری پارہ بتاتا ہے
ابابیلوں کی فطرت میں ہے حق گوئی و بیباکی
وہ اپنے کنکروں کے ساتھ حق۔ کا ساتھ دیتے ہیں
وہ ہر سچائی کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیتے ہیں
مگر اب مسئلہ یہ ہے گلوبل دائرے میں
کب یہ۔ پنچھیوں کو اجازت ہے
وہ اپنے آپ، کوئی فیصلہ چوپال میں کر لیں
وہ جس میں ابرہہ، نہ ابرہہ کی فوج شامل ہو
ابابیلوں کو لیکر کشمکش پھیلی ہے ذہنوں میں
دباؤ ہی دباؤ ہے تناؤ ہی تناؤ ہے
نہایت ہو کا عالم ہے
عجب سی بے یقینی ہے
سرتی سرزمیں کے ساتھ لپٹی بے زمینی ہے
دلوں میں کیا، اچانک یہ سرایت، کرنے والا، ہے
ابابیلوں کے ہاتھوں سے یہ لشکر مرنے والا ہے

مگر اک شرط ہے یہ خوف کا چولا اتارو تم
اگر یہ حوصلہ تم میں نہیں تو جان لینا پھر
ہمارے عہد کا گوتم
بڑا مکار ہے عیار ہے اور سپر پاور ہے
یہ ظالم بھیڑیا ہے بھیڑ کے جامے میں رہتا ہے
یہ اپنے دائرے کے بے بسوں مجبور لوگوں کو
اچانک چیر سکتا ہے اچانک پھاڑ سکتا ہے
وہ سب کی گردنوں میں اپنے پنجے گاڑ سکتا ہے
گلوبل دائرے کے سب کے سب مجبور لوگوں کو
سسکتی فاختاؤں کو بھٹکتی آتماؤں کو
ہمارے عہد کے گوتم نے یہ پیغام بھیجا ہے
کہ وہ اک سپر پاور ہے
زمیں سے چاند تک پھیلی ہوئی اسکی حکومت ہے

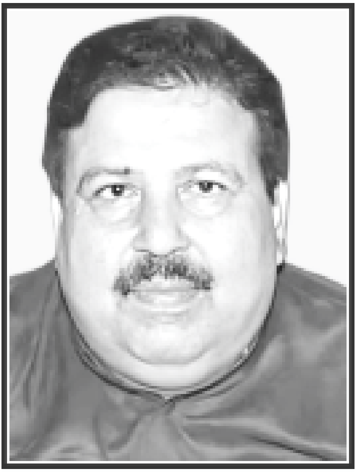

مسعود احمد

محاصرہ

یہ علامتیں
محض نشانات نہیں
حروفِ تہجی کے خوش نما ریزے ہیں
جو نیرنگِ خیال کے جزیرے پر
تمہاری یاد کا مقسوم بن کر
خاموشی سے اُترتے رہتے ہیں
یہاں محبت
اعلان نہیں
بل کہ محاصرہ ہے
شجر کے تنوں میں پیوست
اضطراب کی چھال چیر کر
جُدائی کے گہرے شگافوں میں
پتوں میں جا چھُپا ہے
آنکھیں
حیرت کے گرداب میں
جیسے بجھے ہوئے آتش فشاں کے عقب میں
کوئی خواب
اپنے ہی ملبے تلے دبا ہو
کبھی توہین کا لاوا
سمندر سے باہر نہیں گرتا
مگر اس کی تپش
خاموشی سے رگوں میں سرایت کرتی ہے
میں بقلمِ خود
وجود کی تہوں میں سمٹا
وقت کا جمشید
پیالے کے خالی کونوں سے متصل
نجانے کب سے
کسی محاصرہ کی صورت
تمہارے ہاتھوں میں یرغمال ہوں

امجد بابر

مجھے جنگ پسند نہیں

مجھے جنگ پسند نہیں
تو پھر جنگ کسے پسند ہے
اُسے جو کسی سے ڈرتا نہیں
اُسے جو خون کا پیاسا ہے
وہ جسے کوئی پوچھنے والا نہ ہو
جنگ جو کوکھ اُجاڑتی ہے
جنگ جو چہرے بگاڑتی ہے
جنگ جو قبریں سنوارتی ہے
جنگ جو کتبے اُکھاڑتی ہے
جنگ جو درد بکھیرتی ہے
جنگ جو بخیے اُدھیڑتی ہے
جنگ ہی علم کو پھیرتی ہے
جنگ ہی زخم کو چھیڑتی ہے
جنگ کسے پسند ہے
کسی ظالم کو کسی قاتل کو
کسی غافل کسی باطل کو
کسی جھوٹ میں جینے والوں کو
کسی کھوٹ میں رہنے والوں کو
احساس نہیں کیا کرتے ہیں
کتنے معصوم جو مرتے ہیں
اے کاش کبھی ان پر گزرے
وہ جانے کیا کیا کرتے ہیں
اس قتل کو ظلم کو بند کرو

آسناتھ کنول

سبھی قصے پُرانے ہیں

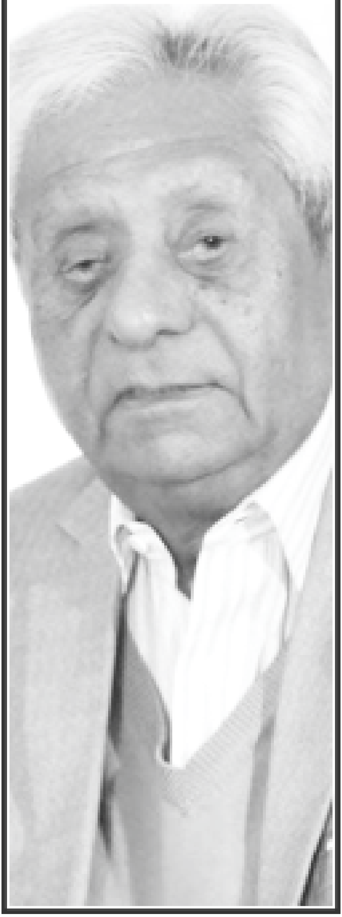

فیاض تحسین

سبھی وعدے پُرانے ہیں
کسی کے ساتھ مرنے اور جینے کے
سبھی وعدے پُرانے ہیں
کسی کی نیلگوں آنکھوں کی جھیلوں میں اُتر کر،
تیرنے اور ڈوبنے کے
سارے افسانے پُرانے ہیں

شب تیرہ میں اک دوجے کو ملنے،
اور ملنے کے بہانے ڈھونڈنے،
سینوں میں دبکی خواہشوں سے خواب بُننے،
اُس سے ملنے اور پھر مل کر بچھڑنے کے
سبھی قصے پُرانے ہیں

نیا ہے کُچھ تو بس یہ ہے کہ اب تم ہو
تُمھارے ساتھ مرنے اور جینے کے لیے میں ہوں!

رونے کی تھراپی (چھوٹی بہن کی مرگ پر)

(نثری نظم)

وہ جب میکے آتی
مجھ سے سر پہ پیار دعائیں لینے کے بعد
والدین کی تصویروں کی جانب بڑھتی
اپنے دوپٹے کے پلو سے گرد جھاڑتی روتی جاتی
مجھے بھی رلاتی
رونا اس کا اوڑھنا بچھونا تھا

سسرال گھر میں اس کی عیادت کے لئے
گیا تھا
she was suffering
from bed sores
بہت روتی تھی
گفتگو سمجھ نہ آتی تھی

وہ جب فالج زدہ جبڑوں سے ہکلاتی
سسرالی گھر کے لوگ کہتے
بے ترتیب باتیں کرتی ہے
جو سمجھ نہیں آتیں
اور روتی جاتی ہے

میں کہتا
رونا
اس کی تھراپی ہے
اعصاب کو متحرک رکھنے کو
آنسوؤں کے ساتھ اور بغیر
اسے رونے دو
یہ اس کے دکھوں کا بیانیہ ہے

سانس کا ناطہ ٹوٹنے پر
وہ
امی جی
ابا جی
اور چھوٹے بھائی قیوم کی روحوں کے ساتھ
پرسکون نظر آئی

روحوں کا مسکن بھی عجیب ہے

کسی صحیفے میں لکھا تھا
ہنسیں کم اور روویں زیادہ

تنویر قاضی

التماس

فیض رسول فیضان

غفلت کے جو پردے ہیں اُٹھا دے مرے مولا!
حرمین کا دیدار کرا دے مرے مولا

اُمت ترے محبوبؐ کی مظلوم ہے جگ میں
ہے بگڑی ہوئی بات بنا دے مرے مولا

پھر عالمِ اسلام ہو کُفّار پہ حاوی
ایسا بھی کوئی جلوہ دکھا دے مرے مولا

وہ لوگ کہ جن پر ترا انعام ہُوا ہے
اُن لوگوں کے رستے پہ چلا دے مرے مولا

یارب تُو ہمیں غیرتِ ایمان عطا کر
بارُعب مسلمان بنا دے مرے مولا

تن من کے سبھی زنگ اُتر جائیں الٰہی!
رنگ اپنی محبت کا چڑھا دے مرے مولا

کشمیر و فلسطین ، اب ایران ہدف ہے
وحدت کا چلن ہم کو سکھا دے مرے مولا

کب غلبۂ اسلام کا آئے گا زمانہ
فیضان کو یہ بات بتا دے مرے مولا

"وقت کا سیل رواں سب بہا لے جائے گا"

وقت کا سیل رواں
سب بہا لے جائے گا
ہم رہیں گے وہیں
وقت بیت جائے گا
حوصلہ بھی سمٹ کر مٹھی میں رہ جائے گا
گریز کی چبھن بھی
شاید ایک دن نہ محسوس ہو
تلخیٔ دوراں کی کڑواہٹ بھی مزا دینے لگے
ابدیت کی سمت
وقت رہے گا یونہی رواں
ناتواں قدموں کا ساتھ
کون دے پائے گا
بیتے زمانے کی
خلش رہ جائے گی
یاد کی کھرچن سے کچھ پل نکال کر
خیال کی رکابی کو پروسیں گے
دل کے شکم کی بھوک شاید مٹ جائے
رہ جائیں گی حاصل عمر رواں
تنہائیاں......

نائلہ راٹھور

گل سے یا گلستاں سے ملتا ہے
رنگ کو نم کہاں سے ملتا ہے

---------- انتخاب ----------
- خالد احمد -
---------- نعمان منظور ----------

"امید کے نام اک اور برس"

جینا۔۔۔

ہر حال میں جینا
یہ محض سانس کا تسلسل نہیں
جہدِ مسلسل ہے زندگی اپنی
اک دریا کی مانند
جو پتھروں سے ٹکرا کر بھی
اپنا راستہ خود بناتا ہے

کتابِ زیست کے اوراق پر
وقت کی گرد جمی ہے
اور ہر ورق میں دبے
ادھورے خوابوں کے نوحے ہیں

تہہ در تہہ
غم کی پرتیں ہیں
جیسے خزاں رسیدہ پتے
زمین کی گود میں
چپکے سے دفن ہو جاتے ہیں

الجھنیں
دل و دماغ میں کانٹوں کی طرح
چبھتی ہیں
اور چھلنی چھلنی
کرتی جاتی ہیں

لیکن اب یوں نہیں ہوگا
بالکل بھی نہیں۔۔۔
کیونکہ۔۔۔

اب میں مطمئن ہوں
کہ تقدیر کے افق پر
جو بھی ابھرے گا
میں اسے
اپنی آنکھوں میں سجا لوں گا

وقت
مرہم ہے
زخم بھر دے گا میرے
نہیں تو زمانے کے طنز بھرے نشتر
کربلا کی مٹی سمجھ کر
اپنے زخموں پر لیپ کر دوں گا
میرے زخم
مندمل ہو جائیں گے
لیکن اگر
تم۔۔۔۔

شبیر آکاش

کہیں راستوں کی دھند میں
کھو گئے تو؟
نہیں نہیں،
ایسا نہیں ہو سکتا
یہ میرا وہم ہے
میرے اندر کا گمنام خوف
جو مجھے بیقرار کیے رکھتا ہے
یہی خوف
میرے وجود کا آخری سوال ہے
میری جاں!

شکم کی آگ
لفظوں سے نہیں بجھتی
اور غم
صرف کہانیوں سے نہیں بہلتے

سو میں نے سوچا ہے
دل کی تسلی کے لیے
اک اور برس
امید کے نام کر دوں

شاید
اگلے موسم میں
کوئی خواب
پھول بن کر کھل جائے

اوڈیسیس کی واپسی

جنگل صحرا
دشت کنارے
سات سمندر
گھوم کے سارے
میں اپنی بستی کو لوٹا
کاٹ کے اک بن باس ____
بستی کیا ہے
ہستی کیا ہے
لاحاصل احساس ____

سرخ لکھوری اینٹوں والے
ایک قدیمی اسٹیشن پر
گونج رہی ہے
جانے کب سے
سیٹی کی آواز ____
میں ہوں اور مری تنہائی

چاروں جانب
پھیلی ہے اک یاس ____

بستی تو بستی ہے اب بھی
ایک خرابہ
ایک بیاباں
بھیڑ بھڑکا
اک ویرانہ
زرد حویلی
اینٹ اور گارا
چھت اونچی، خالی گلیارہ
بھیڑ تو ہے پر
لوگ کہاں ہیں
جگری جانی، دشمن، پیارے
اپنے پیارے لوگ کہاں ہیں
میرے سارے لوگ کہاں ہیں

کوئی چہرہ کوئی صورت
پہچانوں ماتھا یا مورت
کوئی نہیں ____
جنگل صحرا
دشت کنارے
سات سمندر
جیت کے سارے
وقت کے ہاتھوں
کھائی کیسی مات ____

عابد رضا

خمیازہ

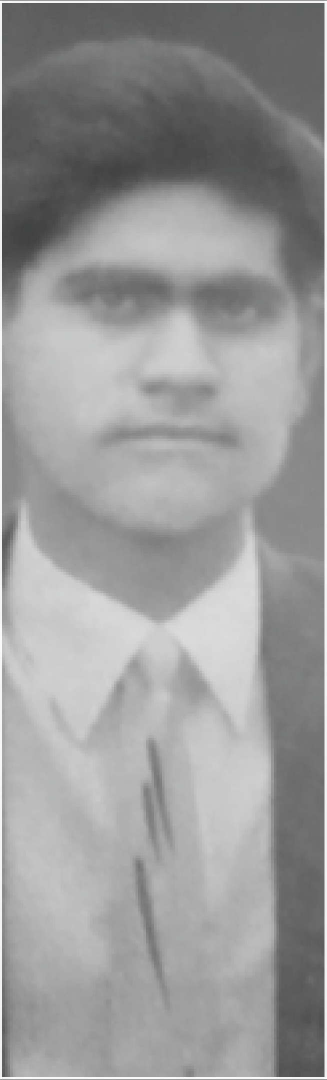

انوار انجم

کہاں یہ دُعا تھی کہ راہِ وفا میں کبھی تو کوئی لمحۂ قُرب آئے
کہاں اب یہ عالم کہ ایک ایک ساعت ہماری
مُلاقات کی رازداں ہے
یہ جی چاہتا ہے، کسی طرح گزرا زمانہ ہی اک بار پھر لوٹ آئے

وہی جسم جو ہجر کی شب میں میرے لئے چشمۂ نور تھا
پاس آیا تو پتھر کی سل بن گیا ہے
نہ اب اُس کے شفاف سینے میں وہ چاندنی کی پھواریں
نہ اب بازوؤں میں وہ چپکی سی چکیلی گدراہٹیں ہیں
یہ عارض ہیں یا دن میں نکلے ہوئے چاند کا مُضمحل عکس ہیں
اور لب جیسے باسی پھلوں کی کوئی سوکھی بے جان سی قاش ہے

اگر وصل کی نعمتوں کا یہی طور ہے تو میں اس طور سے باز آیا
مُجھے تُم خدارا وہی میرا گزرا ہوا دور دے دو
وہ گردن کا خم، وہ نگاہِ تغافل، پھر اک بار میرا مقدر بنا دو
میں نزدیک آؤں تو دامن جھٹک دو
پھر اس جسم، اس دل کی قُربت کی آلودگی سے چھڑا کر
اسے اجنبیت کی دوشیزگی سے سجا دو!

عطائے آسمانی (نثری نظم)

محبت
کسی ہنر کی محتاج نہیں،
نہ یہ پسینے کی کمائی ہے،
نہ خواہشوں کے کھیت میں اُگتی ہے
یہ تو بس
ایک نرم سی خوشبو ہے
جو دل کی خاموش مٹی سے اُٹھتی ہے۔
یہ
کسی کی آنکھوں میں چمکتی روشنی ہے،
لبوں پہ ٹھہری ہوئی مسکراہٹ،
اور دھڑکنوں کے بیچ
اک ان کہی سی سرگوشی۔
محنت کر کے
اسے کمایا نہیں جا سکتا
یہ تو اچانک
کسی کے نام کی طرح
دل پر اُتر آتی ہے۔
یہ عطا ہے
عطائے آسمانی
جیسے بارش کی پہلی بوند
خشک زمین کو چھو لے،
یا جیسے کوئی نرم سا لمس
روح کی گہرائیوں میں اتر جائے۔

نصیب کی کتاب میں
یہ لفظ کم لکھا جاتا ہے،
اور جس صفحے پر لکھا جائے
وہ زندگی کا مقدس باب بن جاتا ہے،
جہاں ہر حرف
مہکنے لگتا ہے۔
یہ
کسی کے انتظار میں گزری ہوئی شام ہے،
کسی کے خیال میں بھیگی رات،
اور کسی کی آواز میں چھپی
زندگی کی سب سے میٹھی صدا۔
زمین کے سفر میں
جب قدم تھکنے لگتے ہیں،
جب راستے بوجھ بننے لگتے ہیں،
تب بھی محبت
آسمان بن کر سایہ کرتی ہے۔
اور پھر
انسان کو یوں بدل دیتی ہے
کہ وہ خود ایک دعا بن جاتا ہے
کسی کے لبوں پر ٹھہری ہوئی۔
محبت
بھی تو وہ راز ہے
جو آنکھوں سے شروع ہوتا ہے
اور دھیرے دھیرے
روح میں اتر جاتا ہے

اور پھر
انسان کو انسان نہیں رہنے دیتا
وہ ایک چراغ بن جاتا ہے
ایک روشن چراغ
جو خود بھی جلتا ہے
اور زمانے کو بھی روشنی دے جاتا ہے
سنو!
محبت کوئی لفظ نہیں
کوئی دعویٰ نہیں
یہ تو ایک کیفیت ہے
ایک حال ہے
جو فقط نصیب والوں کو ملتا ہے
یہی محبت ہے
جو مٹی کو مہکا دیتی ہے
جو دل کو
خدا کا گھر بنا دیتی ہے
یاد رکھنا!
اگر زندگی میں کبھی
کبھی صرف ایک بار بھی
سچی محبت مل جائے
تو اسے سنبھال لینا
اسے تھام لینا
اسے کھو دینا مت
کہ
یہ ہر کسی کو نہیں ملتی
یہ ہر در پہ نہیں اترتی
یہ تو بس
چنیدہ دلوں پہ اترتی ہے
چنیدہ دلوں پر
اور جب اترتی ہے نا
تو انسان کو بدل دیتی ہے
اس کی سانسوں میں اتر جاتی ہے
اس کی دھڑکنوں میں بس جاتی ہے
اور پھر
پھر اسے
زمین پر رہنے نہیں دیتی
اٹھاتی ہے
سنوارتی ہے
نکھارتی ہے
اور آخرکار
اسے آسمان کر دیتی ہے
آسمان کر دیتی ہے
آسمان کر دیتی ہے

سید فرخ رضا ترمذی

ظرف کی حد

کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں
نعمت آتے ہی بکھر جاتی ہے،
جیسے بارش کی بوندیں
ریت پر ٹھہر نہیں پاتیں۔
وہ سمجھتے ہیں
کہ زیادہ مل جانا
خوش نصیبی کی انتہا ہے،
مگر نہیں جانتے
کہ ہر عطا
اپنے ساتھ ایک امتحان بھی لاتی ہے۔
کم ظرف دل
خوشیوں کا بوجھ نہیں اٹھا پاتے،
وہ نعمتوں کو سنبھالنے کے بجائے
انہیں ضائع کر دیتے ہیں،
جیسے نا سمجھ ہاتھوں میں
کوئی قیمتی شے ٹوٹ جائے۔
اصل دولت
وہ نہیں جو ہاتھوں میں آئے،
بلکہ وہ ہے
جو دل میں وسعت پیدا کرے۔
کیونکہ
نعمت سے زیادہ
ظرف کا ہونا ضروری ہوتا ہے
ورنہ فراوانی بھی
انسان کو خالی کر دیتی ہے۔

کومل شہزادی

نثری نظم

ابھی پاس تھے تم میرے
ابھی آنکھوں میں تیری
میں نے خود کو دیکھا تھا
ابھی ہونٹوں نے تیرے
میرے ماتھے کو چوما تھا
ابھی بانہوں نے تیری
میرے سرد جسم کو تھاما تھا
ابھی سانسوں نے تیری
میری دھڑکن کو چھوا تھا
ابھی آواز نے تیری
جادو بکھیرا تھا فضاؤں میں
ابھی خوشبو نے تیری
رقص کیا تھا ہواؤں میں
ابھی پیار تیرا لے چلا تھا
مجھے سپنوں کے گاؤں میں
ابھی دل کے ارپن میں
بنا کر دیوتا تم کو پوجا تھا
خوشبوؤں سے بھرا وجود تمھارا
ابھی تو مجھے محسوس ہوا تھا
ابھی دامن دل میں تھے تم ٹھہرے
ابھی پاس تھے تم میرے

فوزیہ غزل

کرسٹل وادی

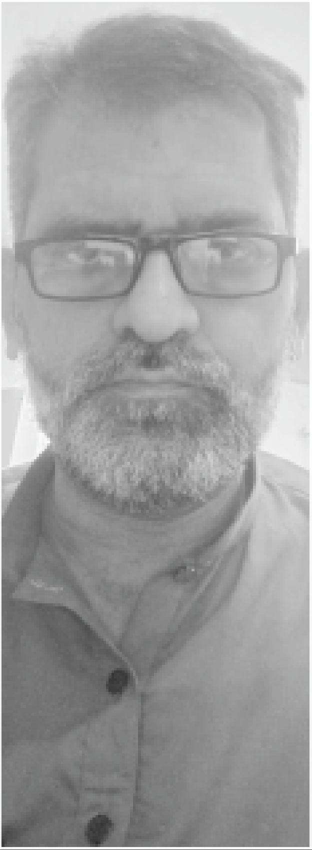

ملکے اور گہرے
سرسبز و شاداب رنگوں سے مزین
نکہت قلم سے آراستہ
دل کو گل گلزار
کر دینے والی خوش بو سے معمور
درختوں کی پُرسکون
وسیع و عریض وادی

....

بے حد متین
زاویہ نگاہ کو وسعت دینے والی
دل و جان کے آر پار
ہونے والی
صاف شفاف
کرسٹل وادی......

محمد عبداللہ

--------------- انتخاب ---------------

- خالد احمد -

کھلتا ہی نہیں خالد یہ قفل ہم آہنگی
یہ مات بھری جیتیں ، یہ جیت بھری ماتیں

-------- نعمان منظور --------

خالد احمد کی یاد میں

وہ شخص
جو لفظوں کے اندھیروں میں
چراغ رکھ جاتا تھا،
آج خاموشی کے ایک طویل سفر پر ہے۔

شہر کے ادبی دروازوں پر
اب بھی اس کی آہٹ باقی ہے،
جیسے کسی پرانے کمرے میں
کتاب بند ہو
مگر خوشبو ٹھہری رہ جائے۔

اس نے تنہائی کے کاغذ پر
دل کی سیاہی سے لکھا تھا
وہ دکھ
جو عام آدمی کے چہرے پر
نظر نہیں آتا۔

وہ جانتا تھا
کہ لفظ صرف لفظ نہیں ہوتے،
وہ زخم بھی ہوتے ہیں
اور مرہم بھی۔

اب جب شام اُترتی ہے
اور کتب خانوں میں
خاموشی پھیلتی ہے،
تو لگتا ہے
کوئی کرسی خالی ہے
جہاں کبھی
ایک شاعر بیٹھ کر
خاموشی کو بھی شعر بنا دیتا تھا۔

خالد احمد
اب شاید کسی اور جہاں میں
لفظوں کی نئی بستی بسا رہے ہوں،
مگر یہاں
ہماری محفلوں میں
ان کی کمی
ایک اداس مصرعے کی طرح
ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔

نعمان منظور

خاموشی کے اُس پار

مَیں جانتا ہوں
یہ گم زمانے
یہ کائناتیں
مرے تخیل سے ماورا ہیں

مگر مَیں کیا ہوں!
اَزل اَبد میں معلق اِنساں
جو اپنے ہونے کا راز اب تک سمجھ نہ پایا

کسے بتاؤں!
زمیں کے ماتھے پہ درج تحریر۔۔۔!
یہ کیا لکھا ہے؟
یہ کون خط ہے
یہ کیا زباں ہے
مجھے تو بالکل خبر نہیں ہے

مجھے چراغِ اَزل اَبد سے۔۔۔
یہ میری راتیں۔۔۔
شکستہ راہیں۔۔۔

مَیں کن جہاتوں بکھر رہا ہوں
تمھیں خبر ہے؟

کوئی بتائے
یقیں دلائے
کہ سامنے جو مہین پردہ ہے
کب اُٹھے گا

نوید صادق

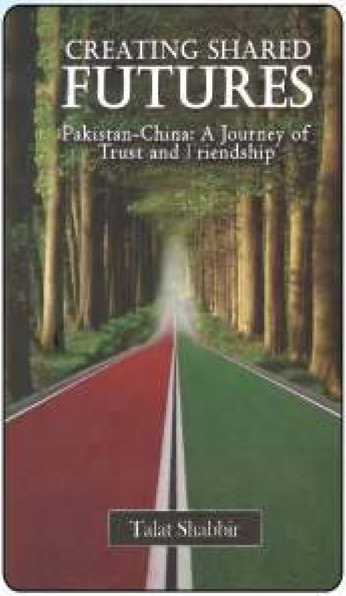
CREATING SHARED
FUTURES
Pakistan-China: A Journey of Trust and Friendship
Talat Shabbir

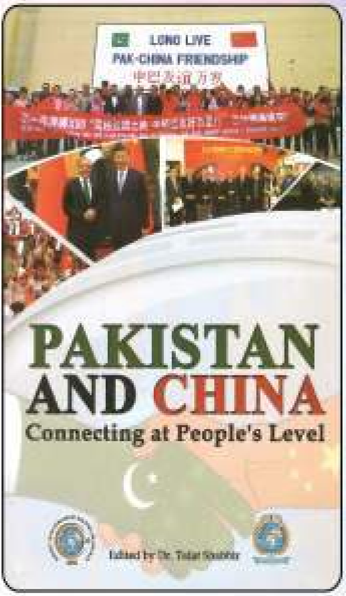
LONG LIVE
PAK-CHINA FRIENDSHIP
PAKISTAN
AND CHINA
Connecting at People's Level
Edited by Dr. Talat Shabbir

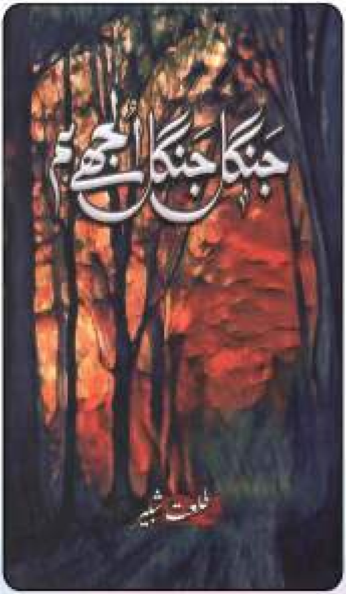
طلعت شبیر

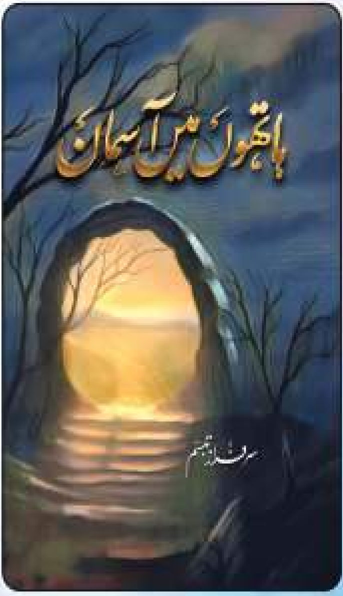
ہاتھوں میں آسمان

تشبیب
خالد احمد
ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
پہلی صدا پرندے کی
خالد احمد
پہلی پو پھٹی پروائی
خالد احمد
نم گرفتہ
دراز پلکوں کے سائے سائے
خالد احمد
خالد احمد